مہوش افتخار

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان، زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہوچکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو، لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزا زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کر کے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بدبو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے...

دوسری قسط

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں، جب جائشہ اور نورہ نے مہر کو گھر ڈراپ کیا تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر بھی وہ دونوں اندر نہیں آئی تھیں۔ ان کے گاڑی آگے بڑھانے کے بعد وہ شاپنگ بیگز اٹھائے گیٹ سے اندر چلی آئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اس نے اچھی خاصی خریداری کرلی تھی۔ جو ہمیشہ کی طرح اس کی ذاتی چیزوں سے زیادہ انجم بیگم، ابراہیم صاحب اور گھر کے لیے نت نئی چیزوں پر مشتمل تھی۔

اسے سامان سے لدا پھندا دیکھ کے دل شیر سرعت سے آگے آیا تھا۔ مہر چیزیں اس کے حوالے کر کے سیدھی ہوئی تو نظریں سامنے پورچ میں اپنی گاڑی کے برابر کھڑی ابراہیم صاحب کی گاڑی سے جا ٹکرائیں۔ وہ بے اختیار چونک گئی۔ یہ وقت ان کے آفس سے واپسی کا تو نہیں تھا۔

"بابا کب آئے؟" اس نے پلٹ کر دل شیر کی طرف دیکھا۔

"آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی آگئے تھے بی بی۔" اس کے جواب نے مہر کو پریشان کر دیا۔

"کیوں خیر تھی؟"

"جی... جی... وہ صغیر صاحب اور بیگم صاحبہ آئی تھیں نا۔" اور مہر اس اطلاع پہ ٹھٹک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کتنی دیر بیٹھے تھے وہ لوگ؟" اس کے بے تاثر لہجے پہ دل شیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کوئی گھنٹہ ڈیڑھ بی بی۔"

مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انجم بیگم کا صبح سے مضطرب اور خاموش انداز گھوم گیا، ساتھ ہی شام میں ان سے ہونے والی اپنی گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہوئی تو جیسے کچھ کھٹک سا گیا۔

"کہیں ان لوگوں نے مجھے قصداً تو باہر نہیں بھیجا تھا؟" اس خیال کے آتے ہی اس کا چہرہ تن گیا۔ لب بھینچے وہ تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی انجم بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو آپ لوگ صبح سے یہ سب پلان کیے بیٹھے تھے۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

"جاؤ جا کے پہلے نماز پڑھو۔" اس کی بات کو نظر انداز کیے انجم بے تاثر لہجے میں بولیں تو مہر کا ضبط جواب دے گیا۔

"میری بات کا جواب دیں مما جان! کیوں کیا آپ لوگوں نے ایسا؟" وہ زور سے بولی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ابراہیم ملک کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے ہی گھر لوٹے تھے۔

"ہم نے جو مناسب سمجھا' وہ کیا۔" ان کی آواز اچانک کمرے میں گونجی تو مہر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کی بات پہ مہر کے چہرے پر دکھ کی کیفیت پھیل گئی۔

"معذرت کے ساتھ بابا جان۔ لیکن میرے حق میں آپ لوگوں نے نہ کل کوئی مناسب فیصلہ کیا تھا اور نہ آج۔" اور ابراہیم صاحب کا چہرہ بے اختیار پھیکا پڑ گیا۔

"ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔ اس لیے آج ہم نے اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ان کی بات پہ مہر کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "اس منحوس رشتے سے تمہاری جان چھوٹے گی تب ہی ہم تمہارے مستقبل کا کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔"

"میرا مستقبل... ہا!" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "ایک بات بتائیں بابا جان۔ کیا ہوں میں آپ سب کے لیے؟ کوئی کٹھ پتلی یا کوئی مذاق؟ میری آبادی' میری بربادی کہیں پہ تو فیصلے کا حق مجھے دے دیں۔" بے بسی کے مارے اس کی آواز چیخ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر فیصلہ کرو۔ یا تو یہ رشتہ ختم ہو گا یا پھر تم قاضی ولا کے لیے روانہ ہو گی۔" ابراہیم صاحب نے آگے کنواں پیچھے کھائی کے مصداق اس کے لیے دو راستے رکھے تو مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ان کی توقع کے عین مطابق جواب دیا تھا ابراہیم صاحب نے "فوراً" سے پیشتر نتیجہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ تم یہ رشتہ ختم کرنے والی ہو۔"

"میں ایسا کچھ..."

"مہر!" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ اس زور سے دھاڑے کہ مہر اپنی پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔ انجم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نہ یہ، نہ وہ۔ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ سارا خاندان ہمیں باتیں بنا رہا ہے۔ شک کر رہا ہے ہماری نیت پہ' بولو میں انہیں کیا جواب دوں۔" غصے سے اسے گھورتے ہوئے وہ ایک قدم آگے آئے تو انجم بیگم نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔ ان کا سہارا ملتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"زندگی کو تماشا بنا کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے' لیکن ایک بات کان کھول کے سن لو۔ میں اب یہ بچپنا مزید برداشت نہیں کرنے والا۔ یہ معاملہ اب ہر حال میں نبٹے گا اور اگر کسی نے میرے خلاف جانے کی کوشش کی تو میں اس سے اپنا ہر تعلق ختم کر لوں گا۔" انجم بیگم کی آنکھوں میں ڈولتی نمی نظر انداز کیے وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

دروازے کی زوردار آواز پہ انجم بیگم کے اٹکے ہوئے آنسو چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر کو سینے سے لگائے وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صغیر صاحب اپنی اسٹڈی میں بظاہر فائلیں کھولے بیٹھے تھے۔ لیکن پچھلے ڈھائی گھنٹوں سے ان کا ذہن بہت سی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس معاملے میں حتمی فیصلہ لے کر انہوں نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ لے لی تھی۔ گو کہ وہ کسی کے آگے جواب دہ نہ تھے۔ مگر پھر بھی اگر آنے والے وقت میں ان کا یہ فیصلہ کسی بہتری کی سبیل نہ بن پاتا تو وہ اپنی ہی نظروں میں معتوب ٹھہر جاتے اور یہی سوچ انہیں مسلسل

مضطرب کیے ہوئے تھی۔

زیب تو سارا راستہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہ بولی تھیں۔ گھر پہنچ کے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ تنہا لاؤنج میں بیٹھے رہے تھے اور پھر تھک کر اپنا دھیان بٹانے کو اسٹڈی میں آ کر فائلیں کھول کے بیٹھ گئے تھے۔ مگر ذہنی کش مکش پر قابو نہ پا سکے تو کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ یوں بیٹھے انہیں نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ جب دروازے پہ دستک کے بعد جائشہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"ڈیڈی!"

"آجاؤ بیٹا!" سر اٹھاتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تو دروازہ کھول کے جائشہ اندر چلی۔

"کیا بات ہے ڈیڈی! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ادھر امی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی ہیں..... وہاں کوئی بات تو نہیں ہوئی نا؟" انہیں دیکھتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوال کیا تو صغیر صاحب نے اک گہری سانس لی۔

"تم نے کھانا لگوایا ہے؟"

"جی میں آپ کو اسی لیے بلانے آئی تھی۔" ان کے بات پلٹ دینے پر جائشہ حیران ہوتی دھیرے سے بولی تو صغیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو آؤ' پہلے کھانا کھاتے ہیں۔" اسے اپنے بازو کے حصار میں لیے وہ دروازے کی جانب بڑھے۔ جائشہ بھی خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو حنان شلوار قمیص میں' آہستہ چڑھتا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دیتے رک کر اسے دیکھنے لگے۔ جو آج خلاف معمول اپنے سیر سپاٹوں کی بجائے جلدی گھر آ گیا تھا۔

"آج تم اس وقت کیسے گھر آ گئے؟"

"بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" اس نے بہانا بنایا۔ صغیر صاحب اثبات میں سر ہلاتے آگے بڑھ گئے تو حنان بھی ان کے پیچھے چل دیا۔

ڈائننگ روم میں نویرہ پہلے سے ان سب کی منتظر تھی۔

"امی نہیں آئیں؟" اس کے سوال پہ حنان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اوں ہوں' تمہارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے منع کر دیا تھا۔" جائشہ نے کرسی کھینچی۔ اس کی بات پہ نویرہ خاموش ہو گئی۔ اس نے زیب بیگم کی کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ تھوڑا سا کھانا کھا لیں مگر..... مزید کچھ کہے بغیر سب نے کھانا شروع کیا۔ تو دونوں بہنوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پتا نہیں وہاں کیا ہوا تھا جو امی اور ڈیڈی دونوں کو ہی چپ لگ گئی تھی۔

"پھر کیا بات ہوئی وہاں پہ؟" اپنا تجسس دبائے حنان نے چند لمحوں کے صبر کے بعد سوال کیا تو دونوں لڑکیوں نے بے اختیار باپ کی طرف دیکھا۔

"کل بھائی جان کا وکیل آ رہا ہے۔ میں نے یہ نکاح ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تو سب کا مارے بے یقینی کے منہ کھل گیا۔

"کیا!" نویرہ کے لبوں سے سرسراتا ہوا فقط یہی لفظ نکل پایا تھا۔

❋ ❋ ❋

"سیم۔" اپنے شانے پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ اور اپنے نام کی پکار پہ گہری نیند سوئے ہوئے سیم کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"ہوں۔" مندی مندی آنکھوں سے اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تھا۔ جہاں مارک کھڑا تھا۔ اس پہ نگاہ پڑتے ہی سیم کے سوئے ہوئے حواس قدرے جاگ گئے تھے۔

"ہاں۔"

"سوری یار! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ لیکن میں آفس جا رہا ہوں۔ تمہیں اس لیے جگا کر جا رہا ہوں کہ جب تم اٹھو تو پریشان نہ ہو۔" مارک نے نرمی سے

کہا۔

"اوکے۔" سیم نے کروٹ لی۔

"ناشتے کا سارا سامان فریج میں رکھا ہے۔" مارک نے مطلع کیا تو آنکھیں بند کیے پڑے سیم کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوکے مام۔۔۔" اس کے شوخ انداز پہ مارک بھی خوشگوار حیرت لیے مسکرا دیا۔ رات کے برعکس اس کی طبیعت میں خاصی بہتری محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس خیال کا اظہار اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

"ہاں ہاں اڑا لو میری محبت کا مذاق۔" مارک نے قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ سیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"قسم سے یوں دہائیاں دیتے ہوئے میری بیوی لگ رہے ہو۔"

"بکومت۔" اس کی پشت کو مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے وہ گھوم کر بیڈ کی دوسری جانب آکھڑا ہوا۔ "کبھی ماں کبھی بیوی۔ تمہیں لگ رہا تو میں جناب کو بزنس پارٹنر نہیں لگ رہا۔۔۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ آفس کب سے جوائن کرنے کا ارادہ ہے؟" اس کے جل کر کہنے پہ سیم نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔

"فی الحال تو میرا صرف ریسٹ کرنے کا ارادہ ہے۔"

"شاباش ہے! اور کام کون کرے گا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں سیم کو دیکھا۔

"تم ہو نا۔" سیم نے حظ اٹھایا۔

"ہاں میں ہوں نا' ہر مرض کی دوا۔۔۔ تمہیں سنبھالوں' تمہارے گھر کو سنبھالوں' تمہارے آفس کو سنبھالوں۔ کیوں نا میں تمہیں گود لے لوں سیم؟" وہ کلس کر بولا تو سیم نے اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"ہاں یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے ممکی۔"

"سیم!" اس کے آنکھیں نکالنے پہ وہ ہنس دیا۔

"اوکے بابا کوشش کرتا ہوں ایک دو دن تک آنے کی۔"

"کوشش نہیں ہر حال میں آنا ہے۔" وہ پلٹ کر اپنی ٹائی لینے کو آگے بڑھا۔

"اور آج شام میرے کزن نے آنا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"ہاں' یاد ہے۔" وہ سیدھا ہوتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اٹھا کر دم لیا ہے تم نے۔" اس نے مارک کی پشت کو گھورا جو ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اچھا کیا ہے۔ دیکھو ذرا کیسا چمکیلا دن نکلا ہے باہر اور تم یہاں بستر میں پڑے ہو۔" ٹائی چھوڑ کے اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو کمرہ چمکتی روشنی سے بھر گیا۔

"زبردست!" سیم کی نظریں نیلاہٹیں چھلکاتے آسمان پہ ایک پل کو جم سی گئیں۔ "یہ تو واقعی باہر گھومنے پھرنے کا دن ہے۔"

"ہاں تو ناشتے کے بعد واک کے لیے نکل جاؤ۔ دیکھو یار غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی ہم سب کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ تم اس حادثے کو بھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ہوں۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود پہ سے لحاف ہٹایا۔

"شکر ہے خدا کا تمہیں میری کوئی تو بات سمجھ میں آئی" مارک نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا۔

"میں اب جا رہا ہوں تم اگر باہر جاؤ۔۔ تو پلیز اپنے بلاک کے پارک تک ہی جانا اور یہ سیل فون اپنے ساتھ لے جانا۔" اس نے قریبی میز پہ اپنا سیل رکھ دیا تو سیم کی آنکھوں میں ممنونیت کا احساس اتر آیا۔ مارک سچ میں ایک بہترین انسان اور باکمال دوست تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے سیم نے خود کو ذہنی طور پہ تیار کرتے ہوئے اپنے جوگرز پہنے تھے' مارک کا موبائل اٹھا کر اس نے عادتاً' اپنے والٹ کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارے تو یاد آیا کہ وہ تو اسی رات ہی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے قصداً" خود کو مزید کچھ سوچنے سے روکا تھا' اور اندر

ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔
الماری میں موجود لاکر کھول کر پیسے نکالنے پر اسے احساس ہوا تھا کہ ہسپتال سے لے کر اب تک مارک ہی تمام اخراجات اٹھائے ہوئے تھا۔ اپنی اس لاپروائی پہ اسے از حد شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ واقعی مارک اور جوزی کی نا صرف ذاتی بلکہ کاروباری زندگی بھی ڈسٹرب کیے ہوئے تھا اور یہ نادانی اسے مزید زیب نہیں دیتی تھی۔
دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے کل سے ہی آفس جوائن کرنے کی ٹھانی تھی۔
وہ اپارٹمنٹ لاک کر کے نیچے آیا بلڈنگ سے نکلنے پر ہوا کے خوشگوار جھونکے نے اس کا استقبال کیا تھا۔
بے اختیار اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سیم نے دلچسپی سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔
آج نجانے کتنے عرصے بعد وہ یوں واک پہ نکلا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے یہ تفریح بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ ایسی تھکی ہوئی تفریحات کو بزرگوں' بیماروں اور بورنگ لوگوں سے منسوب کیا کرتا تھا۔ مگر آج اسے پارک کی پرسکون اور خوشگوار فضا میں' درختوں کی سبز چھاؤں تلے' پرندوں کی آوازیں سنتے ہوئے' احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی ہر ہنگامے سے دور' کچھ نہ سوچنا اور دھیرے دھیرے بے مقصد قدم اٹھانا بھی کتنے لطف کا باعث بن سکتا ہے۔ بالآخر وہ ایک ترتیب سے لگے بنچوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا اور اپنے دونوں بازو بینچ پہ پھیلا دیے تھے۔
وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا جب قریب ہی کسی نے گٹار پہ بڑی خوب صورت دھن چھیڑی تھی۔ وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنے دائیں بائیں اور پھر پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔۔۔ تبھی اس کی نظر پارک کی حد پہ لگے جنگلے میں سے نظر آتے فٹ پاتھ پہ کھڑے ہوئے ایک لڑکے کی پشت سے ٹکرائی تھی۔ جس کے ہاتھ میں گٹار تھا اور نیچے زمین پہ اس گٹار کا خالی کیس کھلا پڑا تھا۔
چند لمحوں کی اوپننگ کارڈز بجانے کے بعد اس کی آواز شامل دھن ہوئی تو سیم مبہوت ہو گیا۔ لڑکے کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔ سیم نا چاہتے ہوئے بھی سُر میں ڈوبے اس گیت کو سننے لگا۔ جو جنگ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کی داستان سنا رہا تھا۔

"اے پہاڑ کی کہر آلود آنکھوں
میرے بھائی کی روح پر گہری نگاہ رکھنا
اور جب آسمان آگ اور دھوئیں سے بھر جائے
تم ڈیورن کے بیٹوں کی حفاظت کرنا۔
اگر یہیں زندگی کا خاتمہ ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ جلنا چاہیے
اور اگر آج کی رات ہمیں مرنا ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ مرنا چاہیے۔۔۔"

سیم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کے سامنے کھڑا ہو کے اسے سنے۔ جواب اگلا بند گا رہا تھا۔

"آہ! اگر میرے لوگوں کو آج گرنا ہے
تو میں بھی یقیناً" یہی کروں گا۔۔۔"

سیم نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھائی۔

"ہاتھ مضبوطی سے تھام لو اور ہم دیکھیں گے
پہاڑوں کے اس پار بتیوں کو نارنجی ہوتے ہوئے۔۔۔"

اس کی آواز سنتے ہوئے وہ تیز قدموں سے پارک کا گیٹ عبور کر گیا۔

"اب میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اندر
میں دیکھ رہا ہوں آگ
درختوں کو جلاتی ہوئی۔۔۔"

فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے بالآخر سیم اس لڑکے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لیکن جونہی اس کی نظر لڑکے کے چہرے سے ٹکرائی' وہ ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ تیئس' چوبیس سال کا لڑکا اندھا تھا۔ سیم کی آمد سے بے خبر وہ اگلی لائن گا رہا تھا۔

"اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
روحوں کو جلاتی ہوئی

میں دیکھ رہا ہوں آگ
ہواؤں میں پھیلتی ہوئی
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے...."

سیم کے دل کو عجیب سا احساس گھیرنے لگا۔ اس کی نظریں اس لڑکے کے چہرے کو بغور تک رہی تھیں۔

"میں دیکھ رہا ہوں آگ
ایک شہر کو جلاتے ہوئے
اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اس پار نارنجی ہوتے ہوئے
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے...."

اس نے گانا ختم کیا تو سیم کے ہاتھ میکانکی انداز میں بج اٹھے۔ اچانک ملنے والی داد پہ وہ لڑکا پہلے چونکا اور پھر سنبھل کر مسکرا دیا۔

"شکریہ!"

"بہت اچھا گاتے ہو تم۔" سیم کی تعریف پہ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"یہ میری جانب سے تمہارا انعام۔" سیم نے جیب میں سے سو ڈالر نکال کر نیچے کھلے کیس کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھمائے تو وہ نوٹ کا احساس پا کے مزید خوش ہو گیا۔

"بہت شکریہ سر! آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کی سادہ سی تعریف پہ سیم مسکرا دیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو تو؟"

"ضرور سر!"

"یہ شاعری تمہاری اپنی ہے؟"

"بالکل سر۔"

"پھر ایک بات بتاؤ۔ تم تو اندھے ہو یار! پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم آگ کو دیکھ رہے ہو 'درختوں کو جلاتے ہوئے' روحوں کو جلاتے ہوئے؟" سیم نے اس عجیب سے احساس کو لفظوں میں ڈھالا جو اسے اس لڑکے کے الفاظ اور اس کی معذوری دیکھ کر ہوا تھا۔

"میرا مطلب ہے نہ تو تم نے آگ کو دیکھا ہے اور نہ ہی تم یہ جانتے ہو کہ جلنا کس عمل کو کہتے ہیں پھر تم

یہ مثالیں کیسے دے رہے ہو؟" اس کی بات پہ وہ لڑکا مسکرا دیا۔

"بے شک میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں سنا تو ہے نا سر۔"

"اور اگر بالفرض تم نے آگ کے بارے میں کبھی کچھ نہ سنا ہوتا تو؟"

"تو پھر جب کبھی میرا آگ سے واسطہ پڑتا اور وہ میرے جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچاتی تو میرا شعور از خود مجھے خبردار کر دیتا کہ یہ چیز جو بھی ہے' باعث آزار ہے۔ اور اگر مجھے دوبارہ اس درد' اس جلن سے بچنا ہے تو مجھے اس سے دور رہنا ہوگا۔" وہ رسان سے بولا تو سیم چونک گیا۔

"یعنی تمہارا برا تجربہ تمہارے شعور کی آنکھ کھولنے کا باعث بن جاتا؟"

"بالکل سر! جو باتیں عام آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں وہ شعور کی آنکھ دیکھ لیتی ہے اور جب یہ کسی چیز کا تجزیہ کرتی ہے تو پھر عام آنکھوں کی طرح کسی بھی پوائنٹ کو مس نہیں کرتی۔"

"یعنی اس کے تجزیہ میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔" سیم کھویا کھویا سا بولا تو لڑکا مسکرا دیا۔

"بالکل!" اس کی بات پہ سیم ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اپنی سوچیں' اپنے احساسات گردش کرنے لگے۔ بے اختیار اس کی نظریں پر سوچ انداز میں سامنے کھڑے لڑکے پہ آ ٹھہریں۔ جو شاید اس کی اس معاملے میں مدد کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کو کس پیرائے میں بیان کرے۔

"اچھا ایک مسئلہ ہے..." اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور تبھی ایک طریقہ اسے "فوراً" سے سوجھ گیا۔ کیوں نا وہ اس سارے معاملے کو اپنے کسی دوست سے منسوب کر کے کہہ سنائے؟ اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور اگلے ہی پل اس کی ساری جھجک دور ہو گئی۔

"مجھے اس میں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ کیا میری مدد کرو گے؟" سیم نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اس وقت؟"

"ہاں۔ میں تمہیں تمہارے ٹائم کے لیے پے کر دوں گا۔" سیم نے اپنی عادت کے مطابق آفر کی تو وہ لڑکا مسکرا دیا۔

"آپ کہیں سر! پیسے کی کوئی بات نہیں۔"

"ارے اس ہی کی تو ساری بات ہے۔" سیم اس غریب لڑکے کی بڑی بات پہ مسکرایا۔

"معذرت کے ساتھ سر! لیکن پھر آپ نے اپنا مسئلہ پیسے کے ساتھ مل کر کیوں نہیں حل کر لیا؟" اور اس کی بات پہ سیم لاجواب ہو کے اس کا منہ تکنے لگا۔

"آپ بولیں سر۔ میں سن رہا ہوں۔"

"کیوں نا ہم پارک میں بیٹھ کر بات کریں؟" سیم کی تجویز پہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گلے میں لٹکتا گٹار اتار کے وہ زمین پہ جھکا تو سیم بے اختیار ہی اس کی مدد کو نیچے بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" گٹار کیس میں بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اس لڑکے کو دیکھا جو ایک طرف رکھی اپنی وائٹ چھڑی اٹھا کر کھول رہا تھا۔

"مائیکل۔" چھڑی کھول کے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سیم کیس اسے پکڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دونوں پارک کی طرف چلنے لگے۔

سفید چھڑی کی ٹک ٹک اور مائیکل کا بنا کسی چیز سے ٹکرائے بڑی سہولت سے آگے بڑھنا' سیم کو حیران کر رہا تھا۔ کسی نابینا شخص کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ اور یہ پہلا اتفاق ہی اس پہ اس تیسری آنکھ کی وضاحت کر گیا تھا' جس کی قوت بینائی اس اندھے کو راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پرکھنے کی طاقت عطا کر رہی تھی۔ یوں کہ وہ اندھا ہو کر بھی اندھا نہیں رہا تھا۔ اور وہ آنکھوں والا ہو کر بھی ٹھوکر کھا گیا تھا۔

پارک میں پہنچ کے سیم اسے لیے ایک بینچ پہ آ بیٹھا تھا۔

"جی سر! اب کہیں۔"

"ایسا ہے مائیکل کہ میرا ایک بہت قریبی دوست ہے۔" سیم نے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔

"اس کی زندگی اور شخصیت دونوں میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے بعد اس کا زندگی کو دیکھنے کا انداز ہی بدل گیا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے اس انداز فکر سے خود ہی گھبرانے لگا۔" مائیکل نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"آپ اس تبدیلی کو واضح کریں گے؟"

"یعنی اسے اچانک سے ان چیزوں کا بھی احساس ہونے لگا۔ جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے 'جیسے کہ موت۔" سیم بے اختیار اٹکا۔ وہ اتنے دنوں میں آج پہلی بار اپنے احساسات کو زبان دے رہا تھا۔ اور اسے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے یکایک موت سے خاص کر بے بسی' بے کسی اور تنہائی کی موت سے خوف آنے لگا۔ اپنے فیصلے جن کے بارے میں اسے کبھی کوئی شبہ نہ رہا تھا ان میں اسے ڈھیروں خامیاں نظر آنے لگیں ... اپنے نظریات 'اپنی ترجیحات 'ہر چیز اسے غلط 'ایک دم بودی لگنے لگیں۔" وہ تھک کر خاموش ہوا تو مائیکل نے گہری سانس لی۔

"یعنی کہ اس کی کامیاب زندگی اچانک گھاٹے کے سودوں سے تعبیر ہونے لگی۔"

"ہاں ایسا ہی ہونے لگا۔" اس نے بوجھل لہجے میں تائید کی۔ مائیکل بے اختیار چونک گیا۔

"ایک بات بتائیں سر۔ یہ سوچیں آپ کے دوست کے لیے پریشان کن سہی۔ لیکن ان کے بارے میں اس کا دل کیا کہتا ہے؟"

"اس کا دل؟" سیم لحظہ بھر کو اٹکا اور پھر جی کڑا کر کے وہ اعتراف کر لیا جو وہ رات تک خود سے کرنے کو تیار نہ تھا۔ "اس کا دل جانتا ہے کہ یہ سوچیں غلط نہیں ہیں۔" اس کی بات پہ مائیکل مسکرا دیا۔

"تو پھر میرے نزدیک آپ کا دوست بہت خوش قسمت ہے سر۔"

"کیا؟" سیم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بالکل سر۔ یہ حادثہ فی الوقت اس کے لیے اذیت کا باعث سہی۔ لیکن یہ وہ برا تجربہ ہے۔ جس نے اسے اس کی غلطیوں کو دیکھنے والی آنکھ عطا کی ہے۔ اسے اس خواب غفلت سے جگایا ہے۔ جس سے اگر وہ نہ جاگتا تو شاید زندگی کی آخری سانس تک غلط راہ پہ چلتا رہتا۔ اپنی غلطیوں کو 'وقت رہتے ہوئے' سدھارنے کا یہ موقع قسمت کتنے لوگوں کو دیتی ہے سر؟" اس نے سوال اٹھایا تو بغور اس کی بات سنتا سیم ساکت ہو گیا۔ اس نہج پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"ہم اندھوں کو جب ہمارا شعور کوئی سبق سکھاتا ہے سر' تو ہم اس سبق کو گرہ سے باندھ لیتے ہیں' کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو دوبارہ ٹھوکر کھائیں گے.... ہم خواہشات کے پیچھے بھاگنا افورڈ ہی نہیں کر سکتے سر' ہمارے اندھیرے ہمیں اس بہادری کی اجازت نہیں دیتے اور آپ کی روشنی آپ لوگوں کو ڈرنے نہیں دیتی۔ اور یہی بہادری آپ کی غلطی ہوتی ہے 'کیونکہ خواہشات کو پانے کی طلب سب سے پہلے عقل کو مارتی ہے اور عقل کا اندھا آنکھ کے اندھے سے زیادہ بری ٹھوکر کھاتا ہے۔ آپ کا دوست غلط تھا اس لیے یہ ٹھوکر کھائی۔ لیکن اس ٹھوکر نے اس کی عقل کی بینائی لوٹا دی جو سب کو واپس نہیں دی جاتی۔ اس لیے وہ سچ میں ایک خوش قسمت انسان ہے۔ بس اسے چاہیے کہ اس سبق کو اب گرہ سے باندھ لے اور اپنی صحیح سمت کا تعین کر لے۔ کیونکہ قسمت اس کے ساتھ ہر بار اتنی ہی نرمی سے پیش آئے یہ ضروری نہیں ہے۔" اور دم سادھے بیٹھے سیم کے اردگرد 'گزری رات کے اندھیرے میں دستک دینے والی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔

ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگاہی کھلتا ہے۔

اور سیم بری طرح چونک گیا۔ "یہ اتنے مشکل الفاظ اسے حرف بہ حرف کیسے اور کہاں سے یاد آگئے

تھے؟ یہ کہاں کی کوڑی کہاں آملی تھی؟" حیرت سے سوچتے ہوئے اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکی تھیں۔ تبھی ایک اور آواز اس کے آس پاس ابھری تھی۔ اس کی اپنی آواز۔

"مطلب؟"

"جس دن اپنی آرزوئیں' اپنی خواہشات کے پیالے کو توڑ دو گے' اس دن زندگی تم پر حقیقت کے دروازے کھول دے گی۔" اور وہ نا سمجھی کے عالم میں بولنے والے کا چہرہ تکے گیا تھا۔

لیکن آج یہاں اس خالی پارک کے بینچ پہ ایک اندھے شخص کے برابر بیٹھے اسے اچانک ان مشکل جملوں کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے یہ پیالہ خود نہیں توڑا تھا بلکہ قسمت نے خود آگے بڑھ کے اس پیالے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کا سامان کر دیا تھا۔ تو کیا سچ میں وہ ایک خوش قسمت انسان تھا؟ بے یقینی سے سوچتے ہوئے اس نے مائیکل کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں سر؟" وہ نرمی سے مسکرایا تو سیم کو پہلی بار اس کے چہرے پہ موجود سکون کا احساس ہوا۔ اتنی بڑی محرومی کے باوجود اتنا سکون! ان دونوں کا تال میل وہ بھی ایک ہی چہرے پہ۔ سیم کے اندر ربڑے عجیب سے احساسات جگا گیا تھا۔

"اپنی خوش قسمتی کا یقین کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ حساب لگانا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے؟" وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ تب کہیں جا کے آگہی نے اپنا در وا کیا تھا۔ اپنے ساتھ برتی جانے والی اس سختی پہ اس کا دل ملال سے بھر گیا تھا۔

اس کی بات پہ مائیکل نے اک گہری سانس لی۔ وہ شروع میں ہی جان گیا تھا کہ یہ اس کے کسی دوست کا نہیں بلکہ خود اس کا مسئلہ ہے۔

"قیمت؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ قدرت غلط کاموں کی تصحیح کن قیمتوں پر کرتی ہے؟" بنا کچھ جتائے اس نے سادہ سے انداز میں سوال کیا تو سیم کا سر خود بہ خود نفی میں ہل گیا۔

"نہیں۔"

"اگر آپ کی قسمت میں زندگی بھر کی کوئی معذوری نہیں لکھی گئی۔ آپ کے مال و دولت اور رتبے میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور آپ کے پیاروں کو آپ سے چھینا نہیں گیا تو یقین مانیں سر! آپ کو یہ خوش قسمتی قدرت نے یونہی دان کی ہے۔"

اور اس کی بات سنتا سیم ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"واقعی! اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی تاوان کے طور پہ بھرنی پڑ جاتی تو؟" یکایک اسے خود کو ملنے والی تکلیف ایک ہلکا سا جھٹکا لگنے لگی اور ساتھ بیٹھا نوجوان ستر' اسی سالہ درویش۔ بھلا اسے یہ آگاہی کہاں سے ملی تھی؟

"اتنی چھوٹی سی عمر میں تم اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتے ہو مائیکل؟" وہ اپنی حیرت کو زبان دینے سے خود کو روک نہ پایا تھا۔ اس کے سوال پہ مائیکل ہنس پڑا۔

"شعور کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا سر۔" اور سیم اپنی جگہ پہ خجل سا ہو گیا۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔ ورنہ اس وقت میں تمہارے برابر بیٹھا یہ سوال نہ پوچھ رہا ہوتا۔" اور اب کی بار مائیکل کا قہقہہ بے اختیار گونج اٹھا۔ اس کی ہنسی سیم کو بھی مسکرانے پہ مجبور کر گئی۔

"گھر جائیں سر! اور اگر کسی چیز کا حساب لگانا ہی ہے تو اس بات کا حساب لگائیں کہ اگر آپ نے یہ غلط فیصلے نہ کیے ہوتے تب آپ کیا کھوتے اور کیا پاتے۔ مجھے یقین ہے آپ کو بہت سی الجھنوں کے سرے مل جائیں گے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"ہوں۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سیم نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مائیکل! جن میں' میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ میری اس تکلیف میں تم نے کس طرح سے میری مدد کی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آپ کی یا آپ کے دوست کی سر؟" وہ شرارت سے بولا تو سیم لحظہ بھر کو ٹھٹکا اور جیسے ہی اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا' وہ شرمندگی سے سرخ چہرہ لیے ہنس پڑا۔

"میں تمہیں سچ میں کبھی نہیں بھولوں گا بروٹس۔" اس نے مائیکل کے بازو پہ دوستانہ انداز میں مکا مارا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"میں بھی سر۔" اور زندگی میں پہلی بار سیم کی آنکھوں میں کسی کے لیے حقیقی ستائش آن ٹھہری تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح "قاضی ولا" میں اپنے ساتھ بوجھل سی خاموشی لے کر طلوع ہوئی تھی۔ گزری رات بہت سے لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ ایسے میں اگلے دن نہ تو گھر میں علی الصبح کی چہل پہل تھی اور نہ ہی ناشتے کی میز پر معمول کی رونق۔ ہر کوئی خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹ پہ جھکا ناشتے میں مصروف تھا۔

"حنان نہیں اٹھا؟" صغیر صاحب نے ملازم کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے سوال کیا۔

"حنان صاحب تو صبح ہی چلے گئے تھے صاحب جی۔"

"کہاں گیا ہے؟" صغیر صاحب کے ساتھ باقی سب نے بھی چونک کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں جی۔" اس کی لاعلمی پہ صغیر صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"یہ لڑکا بھی نا..... جاؤ فون لے کر آؤ۔" ان کی ہدایت پہ ملازم اگلے ہی لمحے کارڈلیس لے آیا۔

فون ہاتھ میں لے کر انہوں نے حنان کا نمبر ملایا۔ لیکن متواتر بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو انہیں غصہ آ گیا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" فون میز پہ پٹختے ہوئے انہوں نے زیب بیگم کی طرف دیکھا۔

"آپ فکر مت کریں۔ مصروف ہو گا کہیں۔"

"ہاں سارا ملک یہی تو چلا رہا ہے۔" خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ اپنی جانب سرکایا۔ ان کے چہرے کا غیر معمولی تناؤ ان کی ذہنی کیفیت کا ترجمان تھا' جسے جائشہ اور نویرہ نے با آسانی محسوس کر لیا تھا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت دونوں میں نہ تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کے وہ تیار ہو کر آفس چلے آئے تھے۔ اپنی پی اے سے دن بھر کا شیڈول سنتے ہوئے بھی ان کا دھیان مسلسل ابراہیم صاحب کی طرف تھا۔ ایسے میں حنان اندر داخل ہوا تو ان کا سارا غصہ اس کی جانب منتقل ہو گیا۔

"کہاں تھے تم؟" پی اے کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو بوجھل قدموں سے چلتا ان کے مقابل آ بیٹھا تھا۔

"سائٹ پر تھا۔"

"اتنی صبح وہاں کیا کرنے گئے تھے؟" ان کے سوال پر حنان کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یونہی۔" وہ آہستگی سے بولا تو صغیر صاحب چونک گئے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" پیپر ویٹ گھماتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں۔

"حنان! مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ نہیں ہوا۔" جھنجلا کر اس نے پیپر ویٹ کو چھوڑ کے ان کی طرف دیکھا۔

"حنان!" ان کے غصے سے ڈپٹنے پر اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے گویا صغیر صاحب کے اعصاب پہ بم گرا دیا تھا۔

"کیا؟" انہوں نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"میں' میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں ڈیڈ۔" جھجکتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔ تو صغیر

صاحب کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی خشمگیں نظروں کے جواب میں وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

"حد ہوتی ہے... کتنی آسانی سے تم نے اتنی بڑی کہہ دی۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اس فضول گوئی کا کتنا برا نتیجہ نکل سکتا ہے؟" اس کی خود غرضی انہیں مشتعل کر گئی تھی۔

"کوئی برا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اگر آپ اس بات کو اپنی خواہش کہہ کے سب کے سامنے رکھیں گے۔" حنان نے اپنے ارادے سے انہیں آگاہ کیا تو صغیر صاحب بری طرح بدک گئے۔

"ہاں میرا دماغ خراب ہے نا۔ جو میں یہ بات کہہ کر اگلوں کو اپنی نیت پر شک کرنے پہ مجبور کر دوں۔ وہ تو یہی کہیں گے نا..." اچانک ان کا موبائل بجنے لگا تو ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسکرین پہ گھر کا نمبر دیکھ کے انہوں نے فون کان سے لگالیا۔

"ہیلو!" لیکن دوسری طرف زیب بیگم کی بھرائی ہوئی آواز سن کے وہ پریشان ہو گئے۔

"سب ٹھیک تو ہے زیبی؟" ان کی بات پہ حنان نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

"کیا!" دوسری طرف سے تفصیل سن کر ان کے منہ سے فقط یہی نکل پایا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم دونوں ڈرائیور کے ساتھ نکلو۔ میں سیدھا ہاسپٹل آتا ہوں۔ کون سے ہاسپٹل میں ہے؟" اور حنان پریشانی سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں پہنچتا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے انہوں نے عجلت میں فون بند کیا۔

"مہر بخار کی حالت میں سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے گئے ہیں کیونکہ اسے ہوش نہیں آ رہا۔" جلدی جلدی ٹیبل کی دراز لاک کرتے ہوئے انہوں نے پوری تفصیل حنان کے گوش گزار کی تو وہ بھی گھبرا گیا۔

"او گاڈ۔ کہاں لے کر گئے ہیں اسے؟" جواباً صغیر صاحب نے شہر کے مشہور ہسپتال کا نام لیا تو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی آپ کی ساتھ چل رہا ہوں۔" اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ صغیر صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل دیے۔

وہ دونوں ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے تو زیب اور جائشہ پہنچ چکی تھیں۔ سب کو کوریڈور میں دیکھ کر وہ تیز قدموں سے ان کی جانب چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر ابراہیم صاحب اور روتی ہوئی زیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مہر کو ہوش آیا؟" قریب پہنچتے ہی صغیر صاحب نے پریشانی سے سوال کیا تو متفکر سے ابراہیم ملک کا سر نفی میں ہل گیا۔

"ابھی نہیں ڈاکٹرز ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ نہ ہی ہوش میں آئے تو اچھا ہے۔" کرسی پہ بیٹھی انجم اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولیں۔ سب نے بے اختیار پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ آپ دونوں نے 'میری بچی کو اس حال تک پہنچانے والے صرف اور صرف آپ دونوں ہیں۔" ابراہیم صاحب اور صغیر قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے بولیں تو دونوں نے نظریں چرالیں۔ جبکہ زیب بیگم کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔

"اب کیوں نظریں چرا رہے ہیں آپ لوگ' کہیں نا ڈاکٹرز سے کہ لگائیں اسے زہر کے انجکشن' تاکہ گلو خلاصی ہو ہم سب کی۔" ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ ان کے مقابل آ کھڑی ہوئیں۔

"انجم پلیز..." ابراہیم صاحب نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا' لیکن وہ بے اختیار پیچھے ہٹیں۔

"مت چپ کروائیں مجھے ابراہیم۔ مت چپ کروائیں۔" ان کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

"آپ کو کیا پتا وہ بچی دن رات کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ وہ کتنی تکلیف میں ہے آپ کو کیا خبر!"

"کیوں نہیں۔ سب جانتا ہوں میں تب ہی تو...."

"کچھ نہیں جانتے۔ یہی تو افسوس ہے کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔" انہوں نے ایک سلگتی نظر حنان پہ ڈالی۔ تو اس کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ لیکن چونکہ وہ اس وقت کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اسی لیے خاموش کھڑا ضبط کرتا رہا۔

"بس میں نے ایک فیصلہ کیا ہے.... آج کے بعد مہر کی زندگی کا ہر فیصلہ وہ خود لے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس سے کسی بھی معاملے میں زور زبردستی نہیں کرے گا۔"

وہ دو ٹوک لہجے میں بولیں تو ابراہیم صاحب سمیت سبھی خاموش ہو گئے۔ لیکن حنان کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ اس نے ایک کھا جانے والی نظر انجم بیگم پہ ڈالی اور لب بھینچے تیز قدموں سے کوریڈور کے دوسری جانب آ کھڑا ہوا۔

"یہ لڑکی....!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اندر جا کے سچ میں مہر کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے۔

☼ ☼ ☼
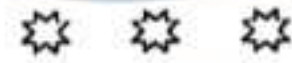
دونوں بازو سر کے نیچے رکھے وہ بیڈ پہ چت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اسے گھر آئے گھنٹہ ڈیڑھ ہونے کو تھا مگر اس کا ذہن تا حال پارک میں 'اپنی اور مائیکل کی ہونے والی گفتگو میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کے پچھلے کئی دنوں کا ذہنی تناؤ ہوا میں دھواں بن کے غائب ہو گیا تھا۔ اپنی خوش بختی کا احساس اسے اندر سے مضبوط کر گیا تھا۔ اب اسے اپنی سوچ میں آنے والی تبدیلی سے نہ تو گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی انجانا سا خوف۔ بلکہ اپنی اور مائیکل کی گفتگو کو دہراتے ہوئے وہ ماضی کی کتنی ہی باتوں کو بلا جھجک سوچے گیا تھا۔ نکتے سے نکتہ نکلتا گیا تھا۔ اور سود و زیاں کے وہ کھاتے جنہیں مائیکل نے کھولنے کا مشورہ دیا تھا از خود کھلتے چلے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ آج جس مقام پہ وہ بالکل اکیلا کھڑا تھا وہ وہاں ہرگز نہ ہوتا اگر جو وہ اپنے ماں باپ کے خلاف جا کے سوزی سے شادی نہ کرتا۔ سوزی کے عشق میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ اپنے ماں باپ سے لاتعلقی اختیار کی تھی۔ اپنی ایک الگ ریاست قائم کی تھی جس کا وہ تنہا وارث و مختار تھا۔ لیکن کیا یہ سب اس نے سچ میں صرف سوزی کی خاطر کیا تھا؟ کیا سوزی حقیقت میں اسے اتنی ہی پیاری تھی؟ بیٹھے بیٹھے اس کے دل نے سوال کیا تو سیم نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

نہیں۔ اس نے یہ سب اپنے لیے اور اپنی محبت میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو اپنا پہلا عشق آپ ہوا کرتے ہیں۔ ان کے لیے اہم ہوتی ہیں تو ان کی خواہشات اور ان کی ترجیحات۔ جن کی اگر نفی کی جائے تو وہ خود سری اور سرد مہری کی انتہاؤں کو پہنچ جاتے ہیں اور ان انتہاؤں پہ انہیں اپنے سوا کوئی یاد نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سوزی تو بس ایک بہانہ بنی تھی۔ ورنہ اصل جنگ تو اس کی انا کی تھی، جسے اس کے باپ نے چیلنج کرنے کی غلطی کر دی تھی۔ نتیجے میں وہ ہر رشتے کی تمیز بھول گیا تھا۔ وہ بنا سوچے، بنا پرکھے ہر چیز کو برباد کرنے پہ تل گیا تھا۔ صرف اور صرف برباد اور ایسا کرتے ہوئے اسے کتنا سکون، کتنا مزہ آیا تھا.... یہ سوچ کر اسے اب شرمندگی ہو رہی تھی۔ بے حد شرمندگی کیا وہ دو انسان جو اس کے ماں باپ تھے اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی ــ سوائے اس کے گرد چکرانے کے اور کچھ نہ کیا تھا اتنے برے سلوک کے مستحق تھے؟ دل نے دوسرا سوال اٹھایا تو سیم نے مارے اذیت کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

اور تبھی اس کی بند آنکھوں کے پیچھے اس کا خواب ایک جھماکے سے روشن ہو گیا۔

بھوک، کتے، بھاگتے قدم، مدد کو کھلتا دروازہ اس کے قدموں کا دہلیز کو چھونا اور اس کا اس مدد کو ٹھکرا دینے کا غلط فیصلہ.... یعنی وہ دروازہ۔ وہ پناہ گاہ.... آن واحد میں

پزل کا گمشدہ حصہ اپنی جگہ پہ آ کے بیٹھا تو سیم کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔

اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ اس دروازے سے اندر داخل ہو جاتا تو خواب اور حقیقت دونوں میں ہر مصیبت سے امان پا جاتا۔ لیکن وہ اس دروازے کو کھلا چھوڑ کے واپس لوٹ آیا تھا۔ بھوکے کتوں کے درمیان، بڑھتے اندھیروں کے درمیان اور بالآخر کچرے کا ڈھیر اس کا مقدر بنا تھا۔ خواب میں بھی اور حقیقت میں بھی۔ یعنی وقت نے اسے اور اس کے فیصلے کو غلط ثابت کر دیا تھا اور اب غور طلب بات یہ تھی کہ اگر وہ غلط تھا تو اس جنگ میں صحیح کون ثابت ہوا تھا؟ اس کے دل نے تیسرا اور اہم ترین سوال اٹھایا تو سیم کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"او خدا نہیں! کم از کم یہ نہیں۔" کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اس جیسا خود پرست شاید اپنے ہوش میں پہلی بار اوپر والے کے سامنے گڑگڑایا تھا۔ لیکن قبولیت کی گھڑی گزر چکی تھی۔ پزل مکمل ہو گیا تھا اور تصویر، بند پلکوں کے پیچھے بھی واضح تھی.... اس کی سب سے بڑی غلطی کی تصویر۔ واضح اور شفاف اس کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹرز مہر کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس کی ذہنی حالات انہیں خاصی الجھی ہوئی لگی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے نیند کا انجکشن لگا کے سلا دیا تھا۔ ویسے بھی سیڑھیوں سے گرنے سے اسے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں، سو ڈاکٹرز نے اسے ایک دن مزید اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے ہوش میں آنے پر حنان کے سوا سبھی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ اس اطلاع کے بعد حنان وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کے لیے مزید وہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا۔ سوئی ہوئی مہر کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پہ لگی چوٹوں کے نشان اور نیل دیکھ کے سبھی کا ملال بڑھ گیا تھا۔ خاص کر مغیر صاحب کا۔ جو اس سارے حادثے کا ذمہ دار خود کو سمجھتے ہوئے بے حد دلگرفتہ ہو گئے تھے۔ زیب، انجم اور ابراہیم صاحب وہ ان تینوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے احساسات سے زیب بخوبی واقف تھیں۔

وہ ان کے شوہر تھے اور وہ ان کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔ اس وقت کون سی بات ان کے دل کو لگی تھی، زیب اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن اس بار وہ چاہ کر بھی ان کا بوجھ نہیں بانٹنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے اندر اپنے فیصلے کی سنگینی اور بدصورتی کا جو احساس جاگا ہے وہ قائم رہے، تاکہ دوبارہ ان سب کی زندگیاں حنان کے ہاتھوں کھلونا بننے سے محفوظ رہیں۔

✡ ✡ ✡

مارک نے تیسری بار اپنا سیل نمبر ملایا تھا۔ لیکن اس بار بھی مسلسل جاتی بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے سیم نے فون نہیں اٹھایا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ریسیور پریشانی سے کریڈل پہ پٹخ دیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" غصے سے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنی سیکریٹری کو بلایا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں جینی۔ تم پلیز بعد میں مینیج کر لینا۔" وہ اپنی جگہ سے عجلت میں اٹھا اور پھر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

سیم کے گھر کی طرف گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ ساری سچویشن دن بہ دن اس کے لیے مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ جہاں ایک پل کو اسے لگتا کہ سیم کی طبیعت سنبھل گئی ہے، وہیں اگلے لمحے کوئی نہ کوئی بات اسے اپنی رائے بدلنے پہ مجبور کر دیتی۔ اب بھی اسے رہ رہ کر سیم کے حوالے سے مختلف واہمے پریشان کر رہے تھے۔ ایسی ہی الجھی ہوئی سوچوں میں گھرا وہ بالآخر منزل پہ آ پہنچا تھا۔

سیم کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے گھنٹی

بجانے کے بجائے جیب سے چابی نکالی تھی اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

"سیم!" پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی لاؤنج پہ ڈالی تھی۔ سرعت سے آگے آتے ہوئے اس کی نظر سامنے موجود میز پہ پڑے اپنے سیل فون سے ٹکرائی تھی۔ اور اسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔ شاید وہ اندر ہی کہیں تھا۔

وہ تیز قدموں سے سیم کے بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا سیم کو کاؤچ پہ بیٹھا دیکھ کے اس کے دل نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ وہ نجانے کس دھیان میں گم بیٹھا تھا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی سیم۔ میں کب سے تمہیں..." بولتے ہوئے وہ اس کے سامنے آیا۔ لیکن جونہی اس کی نظر اس کے چہرے پہ پڑی وہ اپنا جملہ پورا کرنا بھول گیا۔

اس کے چہرے اور آنکھوں کی سرخی اس کے رونے کی گواہ تھی۔

"کیا ہوا سیم؟ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ تیزی سے اس کے نزدیک آیا تو اسے سیم کے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کا احساس ہوا۔ جو کہ بالکل نیا تھا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" وہ چونکا۔ سیم کا اپنا لیپ ٹاپ تو دیگر چیزوں کے ساتھ چوری ہو گیا تھا۔ تو کیا وہ بازار گیا تھا؟

"میں خرید کر لایا ہوں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تو مارک پریشان ہو گیا۔

"تم اکیلے بازار کیوں گئے سیم؟"

"فار گاڈ سیک میکی مجھے بیماروں کی طرح ٹریٹ کرنا بند کرو۔" سرعت سے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر کاؤچ پہ رکھا۔

"اوکے نہیں کرتا۔" مارک نے اک گہری سانس لی۔ "لیکن مجھے بتاؤ۔ کیا پہلے تم اس طرح بیٹھ کر روئے ہو کبھی؟"

"پہلے زندگی نے میرے منہ پہ حقیقت کا طمانچہ بھی تو نہیں مارا تھا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا مارک کا ضبط جواب دے گیا۔

"سنو۔ خود سنو۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا یہ نارمل گفتگو ہے؟" اس کے سوال پہ سیم لحظہ بھر کو تھم سا گیا۔

"وہ عورت صرف میرا پیسہ اور میری قیمتی چیزیں چرا کر نہیں بھاگی، بلکہ وہ مجھ پہ میری اوقات اور میری عقل کی حقیقت واضح کر کے بھاگی ہے۔ اس کے جوتے کی نوک نے جب مجھے یہاں۔" سیم نے اپنی پسلیوں کو چھوا۔ "یہاں ضرب لگائی تھی نا تو درد سے زیادہ ذلت کے احساس نے میرے روم روم کو بھگو دیا تھا۔ آنسو، خوف اور درد کا ملا جلا ذائقہ کیا ہوتا ہے یہ اس رات میں نے جانا تھا اور بے بسی کیسی بساند بھری کیفیت کا نام ہے، اس کا احساس مجھے اس کچرے کے ڈھیر پر گر کر ہوا تھا... اور تم کہتے ہو کہ میں پہلے کی طرح نہیں رہا؟"

شدت جذبات سے سیم کی آواز گھٹ سی گئی تھی اور مارک وہ تو جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"ہسپتال کے بستر پہ، گھر کی تنہائی میں، سوتے جاگتے ہر لمحہ، ہر پل میں نے اپنی سو کالڈ کامیاب زندگی میں کامیابی کو پاگلوں کی طرح تلاش کیا ہے۔ اپنا احتساب کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؟ ٹوٹل فیلئیر (بالکل ناکام) کمپلیٹ لاسٹ۔ (مکمل نقصان)" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "میں زندگی میں اپنی آرزوؤں کے پیالے کو بھرنے میں، اتنا مگن، اتنا گم رہا کہ جب یہ پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا تو سوائے تنہائی اور تہی دامنی کے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ میں نے اپنا ہر قیمتی اثاثہ ان بے معنی خواہشات کی نذر کر دیا... دیکھو تم خود دیکھو۔" اس نے کاؤچ پہ رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کے مارک کی نظروں کے سامنے کیا۔ تو اس کی ساکت پتلیوں میں جنبش سی ہوئی اور وہ اسکرین پہ جا ٹھہریں۔ ایک سیکنڈ۔ دو سیکنڈ۔ تیسرے سیکنڈ اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل سی گئیں۔

"یہ، یہ تو..." پہچان کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ وہ

اسکرین پہ موجود چہرے کو دیکھتا حیران رہ گیا تھا۔ حیران اس بات پر نہیں کہ یہ چہرہ اچانک کیسے سامنے آگیا تھا۔ بلکہ اس بات پر کہ وہ چہرہ سیم کے لیپ ٹاپ پہ کیا کر رہا تھا۔

"اور یہ 'یہ دیکھو۔" مارک کی بات کا جواب دیے بنا اس نے اسکرین پر تصویر کے برابر انگلی رکھی تو مارک کی نگاہیں میکانکی انداز میں مطلوبہ نقطے پہ جا ٹھہریں اور پھر ساکت ہو گئیں۔

"اب پتا چلا میں آج کیوں بیٹھ کر رو رہا ہوں؟" اس نے دلگرفتی سے پوچھا تو مارک کی خاموش نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پر آٹھہریں۔ اس کا رونا اور اس کی باتیں کچھ بھی اسے اب پہلے کی طرح عجیب اور بے معنی نہیں لگ رہا تھا۔

"میری غلطیوں نے بالآخر مجھے غلاظت کے ڈھیر پہ تنہا لا پھینکا مارک۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہ غلط فیصلے نہ لیتا تو بدلے میں کیا پاتا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ حتمی لہجے میں بولتے ہوئے اسے حیران کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب مہر نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے بیدار ہوتا دیکھ کر تسبیح کرتی انجم بیگم کا ہاتھ لحظہ بھر کو ساکت ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے انہوں نے خوشی سے بھرپور آواز میں بہن کو پکارا تھا۔

"زیب! مہر اٹھ گئی ہے۔" اور زیب بیگم کا مرجھایا ہوا چہرہ یک لخت کھل اٹھا تھا۔ دونوں بے چینی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔ جو چہرے اور آنکھوں میں الجھن لیے ناسمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"مہو... میری جان۔" انجم نے بے اختیار ہو کے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"مما جان میں کہاں ہوں؟" اس نے انجم بیگم کا چہرہ تکتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری طبیعت تھوڑی خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے تمہیں اسپتال لے کر آنا پڑا۔" محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا تو مہر کی نظریں ان سے ہوتی ہوئی زیب بیگم کے چہرے پر جا ٹھہریں جو آنکھوں میں آنسو لیے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً" کمرے کا دروازہ کھول کے ابراہیم صاحب اندر داخل ہوئے تھے اور ان دونوں کو مہر کے سرہانے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے مہر کی؟" تیزی سے آگے آتے ہوئے انہوں نے سوال کیا لیکن جو نہی ان کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائیں وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

"ارے میری بیٹی اٹھ گئی۔" ان کے بے قراری سے آگے بڑھنے پر مہر کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں اور پھر وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

ابراہیم صاحب کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پہ آ ٹھہرا تھا۔ اور ایک جھماکے کے ساتھ اس کی خود فراموشی کی کیفیت میں ان کے تند و تیز لہجے کی یاد نے دراڑ سی ڈال دی تھی۔ اس کے دل میں ایک انی سی چبھی تھی۔ اور گزشتہ رات کی ساری اذیت اس کے وجود میں پھر سے آسمائی تھی۔ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت نے انجم اور زیب کے ساتھ ساتھ ابراہیم صاحب کو بھی چونکا دیا تھا۔

"کیا ہوا میری جان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے نرمی سے اس کا گال چھوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"کیوں؟ کیوں لائے آپ لوگ مجھے یہاں 'کیوں مجھے مرنے نہیں دیا.... کیوں؟" ایک جھٹکے سے ان کی جانب سے رخ پھیرتے ہوئے وہ بلک کے رو پڑی تو ابراہیم ملک کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ جبکہ دونوں خواتین کے آنسو بے اختیاری کے عالم میں بہہ نکلے۔

"نہ میری بچی نہ 'اللہ تمہیں ہماری زندگی بھی لگا دے.... تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو گا... سنا تم نے کچھ بھی نہیں ہو گا۔" جھک کر اسے خود

میں سموتے ہوئے انجم بیگم نے تڑپ کر اسے تسلی دی تھی۔ ان کی ممتا بھری آغوش کا احساس پا کے مہر کے آنسو مزید شدت سے بہہ نکلے تھے۔

اسے یوں درد سے نڈھال 'تڑپتا' بلکتا دیکھ کر ابراہیم صاحب کے لیے مزید وہاں رکنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ سرعت سے پلٹے تھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ مہر کی خفگی اور تکلیف نے ان کا دل جیسے مسل ڈالا تھا۔ وہ راہداری میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر آکے گر سے گئے تھے۔

یکایک ان کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا آن پھنسا تھا۔ یہ ایک باپ کی بے بسی کی انتہا تھی' جسے دنیا کے سامنے آشکار ہو جانے سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی مٹھی سختی سے لبوں پر جما دی تھی۔ نتیجتاً "لبوں کی لرزش چھپ گئی تھی' بھرم قائم رہ گیا تھا۔ لیکن سینے پر بڑھتے ہوئے بوجھ کے احساس کو خاموشی سے جھیلنا انہیں ضبط کی کڑی منزل پر لے گیا تھا۔ انہوں نے تو صرف مہر کا بھلا چاہا تھا' لیکن بہتری کی چاہ میں وہ اسے بری طرح چوٹ پہنچا گئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر اپنے رویے کی سختی کا احساس ستا رہا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے بربادی اور بے آبادی کی طرف بڑھتا بھی تو نہ دیکھ سکتے تھے۔

کاش کہ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ماضی میں رونما ہونے والے چند بدصورت واقعات کو کسی حرف غلط کی طرح مٹا دیتے اور اپنے حال کا رخ ہی بدل ڈالتے۔ مگر قسمت کے آگے بھلا کسی کی چلی ہے۔ جو ان کی چل پاتی۔ اپنے ہاتھوں اپنے اور اپنی اولاد کے نصیب میں کون تکلیفیں رقم کرنا چاہتا ہے؟

بے شک حال کی جھولی میں ملال کے بہت سے لمحے ہوتے ہیں۔ بہت سے کاش بہت سے اگر مگر ہوتے ہیں' لیکن۔ بہرکیف ہونا وہی ہوتا ہے۔ جو اللہ نے لکھ رکھا ہوتا ہے۔ سو یہاں بھی وہی ہوا تھا جو پہلے سے طے شدہ تھا اور جسے کاتب تقدیر نے انہی حادثات کے ساتھ ان کی قسمتوں میں رقم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مشینوں میں جکڑے وجود کے گرد ڈاکٹرز' اور نرسیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیکن بستر پہ دراز عورت کی رنگت پل پل بدلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹرز مایوس ہو کے خود ہی اس کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ انہیں اپنی جگہ چھوڑتا دیکھ کے شیشے کے پار آنسو بہاتی زیب نے پریشانی سے پاس کھڑے شوہر کا بازو تھام لیا تھا۔ جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

ڈاکٹرز دروازہ کھول کے باہر چلے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کے زیب کو اپنی سانس پل بھر کے لیے رکتی محسوس ہوئی تھی۔

"معذرت کے ساتھ صغیر صاحب! لیکن پیشنٹ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آپ لوگ ان سے مل لیں۔" سینئر ڈاکٹر نے تاسف بھرے انداز میں کہتے ہوئے صغیر قاضی کا شانہ تھپتھپایا تھا اور زیب کا ہاتھ اپنے نیم وا لبوں پہ آن ٹھہرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"قاضی ولا" بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کے درمیان وہ چپ چاپ بیٹھی تعزیت وصول کر رہی تھیں۔ وہ ہی رسمی جملے' وہی صبر اور حوصلے کی تلقین' وہ ہر آکر بیٹھنے والے کی باتوں اور سوالوں کا جواب بظاہر بڑے حوصلے سے دے رہی تھیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا دل اس لمحے کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ جب کل وہ لوگ ہسپتال سے جنازہ لے کر گھر آئے تھے اور اس سے ان کا پہلا سامنا ہوا تھا۔ وہ سامنا جس کے ہونے سے وہ سب سے زیادہ وحشت زدہ تھیں۔ ایک ایسے گیارہ سالہ بچے کا سامنا' جو اپنی بیمار ماں کی ہسپتال سے واپسی کا شدت سے منتظر تھا۔ لیکن جسے ایمبولینس سے نکلنے والے کفن میں لپٹے لاشے نے سارے بے یقینی کے گنگ کر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں منجمد حیرت اور خوف نے زیب کا دل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھیں تاکہ اسے اپنے سینے سے لگا سکیں۔ لیکن وہ اس وقت ساکت ہو گئی تھیں۔ جب اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"آپ نے مجھ سے پرامس کیا تھا ناکہ آپ میری مما کو صحیح سلامت واپس لائیں گی؟" تنفر سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولا تو زیب کے اردگرد موجود کتنی ہی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ جبکہ زیب کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ انہوں نے بے اختیار ہاتھ دوبارہ آگے بڑھا کر اسے تھامنا چاہا لیکن۔۔۔

"چھوڑیں مجھے!" اس کے چلا کر پیچھے ہٹنے پر زیب کا خالی ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں سے برستے نفرت کے شعلے دیکھ رہی تھیں۔ "مجھے پتا تھا آپ بہت بری ہیں۔ پھر بھی میں نے آپ سے پرامس لیا تھا۔۔۔ مجھے لگتا تھا کہ آپ میری مما سے پیار کرتی ہیں۔ اس لیے اپنا پرامس ضرور پورا کریں گی۔ لیکن آپ نے مجھ سے اپنا پہلا ہی پرامس توڑ دیا۔ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ چلی جائیں آپ یہاں سے چلی جائیں!"

وہ آگے بڑھ کے ان کی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے لگا تھا۔ اس کا یہ اظہار نفرت زیب کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر گیا تھا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بے اختیاری کے عالم میں بہنے لگے تھے۔

"نہ میری جان نہ۔ ایسے نہیں کرتے بیٹا۔" کتنے ہی ہاتھ اس چھوٹے سے بچے کی طرف بڑھے تھے۔

"چھوڑو مجھے۔ میں نے مما کے پاس جانا ہے۔ مما! مما!" بری طرح مچلتے ہوئے وہ دھاڑیں مار مار کے رو پڑا تھا۔ تو قتیبہ دو مضبوط اور شفیق بازوؤں نے اس کے بلکتے وجود کو متاع حیات کی طرح خود میں سمیٹ لیا تھا۔ انہوں نے پھر کسے کیسے سنبھالا تھا زیب نہیں جانتی تھیں۔ لیکن کل سے وہ منظر ان کے اندر جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ ان ننھے ہاتھوں کی نفرت بھری طاقت نے ان کے وجود کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ وہ اپنی عزیز دوست سے کیا ہوا وعدہ کیسے ایفاء کرنے والی تھیں۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کیا بات ہے؟ اتنی گم صم سی کیوں ہو؟" رات گئے جب وہ گھر، مہمانوں اور بچوں کی مصروفیت سے فارغ ہو کے کمرے میں آئی تھیں تو ان کے دل گرفتہ چہرے اور مسلسل خاموش لبوں نے صغیر صاحب کو سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں سنی کو کیسے سنبھالوں گی صغیر؟" وہ روہانسی سی ان کی طرف پلٹی تھیں۔ "وہ تو مجھ سے پہلے ہی اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا اور اب تو وہ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔" بے بسی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے زیب کے آنسو ان کے چہرے پہ پھسل آئے تھے۔

"حوصلہ کرو زیبی۔" صغیر قاضی نرمی سے کہتے ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔ ان کی جذباتی حالت ان کی اندرونی کشمکش کی غماز تھی۔ صغیر صاحب کا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں ان کے شانے پر آ ٹھہرا تھا۔ "وہ بچہ ہے زیب، اس کا روٹھنا، بہلنا اور منانا کوئی مشکل بات نہیں۔"

"آپ نہیں جانتے صغیر! وہ سمجھ داری کی عمر میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی پسند ناپسند ہے۔ کہا تھا یاسمین سے کہ بچوں سے کچھ نہ چھپائے مگر۔۔۔ وہ اپنی چیزوں، اپنے رشتوں کو لے کر عام بچوں سے زیادہ پوزیسو ہے۔ اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو وہ کبھی بھی اتنی آسانی سے نہیں دے گا اور پھر اس کا مزاج۔ وہ کتنا ضدی اور من مانی کرنے والا بچہ ہے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔"

وہ ان کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بولیں تو صغیر صاحب نے اک بوجھل سانس لی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ سنی عام بچوں سے زیادہ اڑیل فطرت رکھتا تھا۔ اس کی ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بے حد بگاڑ دیا تھا۔ ایسے میں زیب کے لیے اسے سنبھالنا سچ میں ایک امتحان ثابت ہونے والا تھا، وہ بھی اس صورت میں جب کہ سنی کسی سچائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تو کیا انہیں اسے

ساری حقیقت بتا دینی چاہیے تھی؟" پیشانی سہلاتے ہوئے انہوں نے پریشانی سے روتی ہوئی زیب کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن فی الوقت وہ ان کے کہے کی تصدیق کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"اچھا روؤ تو مت۔ میں خود اسے آہستہ آہستہ پیار سے سمجھاؤں گا۔" انہوں نے نرمی سے ان کی پشت سہلائی تھی۔ لیکن زیب جانتی تھیں کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہونے والا تھا۔۔۔ گزشتہ تین ماہ میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ پہ معمول کے مطابق خاصا رش تھا۔ یہاں سے کچھ ہی دیر بعد کراچی کے لیے فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ جس میں انجم اپنی فیملی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ انہیں چھوڑنے کے لیے زیب اور صغیر صاحب بچوں کے ہمراہ آئے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ انجم مستقل بنیاد پہ یہاں سے جا رہی تھیں اس لیے قدرتی طور پہ سب ہی کے چہرے ملول اور دل اداس ہو رہے تھے۔ زیب کی آنکھیں تو بار بار آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ وہ آج کل جذباتی طور پہ ویسے بھی بے حد کمزوری کا شکار تھیں۔ ایسے میں اپنے واحد خونی رشتے کی دوری کا احساس انہیں سخت تکلیف پہنچا رہا تھا۔

"آپا! آپ تب جا رہی ہیں جب مجھے آپ کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں تو انجم کی اپنی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"اللہ تمہارے شوہر، تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔ تم کیوں اکیلی ہونے لگیں؟" ان کی محبت بھری خفگی پہ صغیر قاضی قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔

"لیں۔ وہ شوہر کی شکایتوں کے زمرے میں ہی تو رو رو کے کہہ رہی ہے کہ اب وہ اکیلی رہ گئی اور آپ اسے میرا ہی حوالہ دے کر حوصلہ دے رہی ہیں۔" ان کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ حتیٰ کہ روتی ہوئی زیب بھی مسکرا دیں۔

"ذرا پتا تو چلے میں نے آپ کی کس وقت شکایتیں کی ہیں؟" آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے شوہر کی جانب دیکھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں بیگم صاحبہ کہ ہم نے آپ کو شکایت کا موقع ہی کب دیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے ہوشیاری سے سارا کریڈٹ خود لے گئے تو ابراہیم ملک قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

اسی لمحے کراچی جانے والے مسافروں سے چیک ان کی درخواست کی گئی تو ابراہیم ملک نے آگے بڑھ کے صغیر صاحب کو خود سے لگایا۔

"زیبی کا خیال رکھنا صغیر۔"

"آپ فکر مت کریں بھائی جان۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

"پریشان نہ ہونا بیٹا، ہم تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔" ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے جھک کر پاس کھڑی دس سالہ مہر کو چومتے ہوئے گود میں اٹھا لیا تھا۔

"تم سنی اور مہر کے حوالے سے کبھی پریشان مت ہونا۔ وقت آنے پر ہم یہ کام ان شاء اللہ دھوم دھام سے پورا کریں گے۔" ان کی بات پر روتی ہوئی زیب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نیچے جھک کر اس سنہری آنکھوں والے چہرے کو چوم لیا تھا جو بغور سب کو تک رہی تھیں۔

"خالہ کی جان، خالہ کو یاد کرے گی نا؟" اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ زیب نے بے اختیار ہو کے اسے پھر سے چومتے ہوئے خود میں بھینچ لیا تھا اور پھر بہت سی دعاؤں کے حصار میں وہ تینوں ان کی نظروں سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ سے واپسی پہ ان کا استقبال ایک ابتر لاؤنج نے کیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کرسٹل پیسز، پھٹے

ہوئے میگزین اور بکھرے ہوئے کشنوں نے ایک لمحے کے لیے زیب کو دروازے کے پاس ہی بت بنا دیا تھا۔ انہیں راستے میں رکتا دیکھ کے پیچھے آتے صغیر صاحب نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا تھا جو جاشی کو گود میں اٹھائے ادھ کھلے دروازے کے وسط میں کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہ بولتے ہوئے آگے آئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کو دھکیلا تھا' اندر کے منظر نے انہیں بھی لحظہ بھر کو ساکت کر دیا تھا۔

ان کی موجودگی زیب کا سکتہ توڑنے کا باعث بنی تھی۔ وہ بنا ان کی جانب دیکھے اک گہری سانس لیتی آگے بڑھی تھیں۔ ان کا چہرہ مکمل طور پر پرسکون تھا۔

"شمیم!" انہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں ملازمہ کو پکارا تو صغیر قاضی کی نظریں بے اختیار ان پر آٹھہریں۔ جن کی پیشانی ہر شکن سے بے نیاز تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے اندر ملال کے ساتھ ساتھ غصے کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ان کی پکار پہ پریشان حال ملازمہ دوڑی چلی آئی تھی۔

"سلام بیگم صاحبہ! وہ جی یہ دیکھیں سنی صاحب نے کیا کیا۔"

"کب اٹھا تھا وہ؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے زیب نے بالکل نارمل لہجے میں سوال کیا تو ایک پل کو ملازمہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ تو ان کے سخت رد عمل کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں تو۔۔۔ تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ایک نظر دروازے میں کھڑے صاحب پہ ڈالی تھی۔

"ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی۔۔۔"

"سنی۔۔۔!" صغیر صاحب کی بابلند پکار پہ جہاں شمیم کی ڈر کے مارے آواز بند ہوئی تھی۔ وہیں زیب بیگم نے گھبرا کے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کہاں ہے یہ؟ شمیم فوراً لے کر آؤ اسے۔" وہ غصے سے دروازہ بند کرتے آگے آئے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں شمیم۔" زیب نے سرعت سے پلٹتے ہوئے آگے بڑھتی ملازمہ کو روکا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بچہ ہے وہ۔" وہ صغیر صاحب کی جانب آگئی تھیں۔

"تمہیں اس وقت بولنے کی ضرورت نہیں!" ان کے قطعی لہجے پہ زیب نے ان کے تنے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر پلٹ کر شمیم کو بلایا تھا۔

"انہیں باہر لان میں لے جاؤ۔" دونوں سہمی ہوئی بچیوں کو اس کے حوالے کر کے وہ صغیر صاحب کے مقابل آکھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا کریں گے آپ۔ ڈانٹیں گے یا ماریں گے اسے؟" ان کے سوال پہ صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں صغیر! ہم سب ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ کے یہ دونوں عمل ہماری مشکل میں سوائے اضافے کے اور کچھ نہیں کریں گے۔ اس بچے کے دل میں اگر ایک بار آپ کے لیے نفرت اور بدگمانی کا بیج جڑ پکڑ گیا تا تو ہم پھر ساری زندگی بھی اگر کوشش کرتے رہیں گے تب بھی اس جڑ کو اس کے اندر سے اکھاڑ نہ پائیں گے۔"

ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ رسان سے بولیں تو صغیر صاحب کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ جنہیں محسوس کر کے زیب کا ہاتھ نرمی سے ان کے بازو پہ آٹھہرا۔

"آپ کمرے میں چل کر فریش ہوں۔ میں آپ کے لیے اچھی سی چائے لاتی ہوں۔ پھر ہم مل کر سوچتے ہیں کہ ہمیں اس مسئلے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔"

ان کے تسلی آمیز انداز پہ صغیر قاضی کے لبوں پہ محبت بھری مسکراہٹ آٹھہری۔ وہ خود دن رات سنی کو لے کر کتنی پریشان تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن فی الوقت صرف ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو وہ کتنے سلجھے ہوئے انداز میں صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے اس درجہ محبت اور

خلوص پہ صغیر صاحب کو ٹوٹ کے پیار آیا تھا۔
"تمہیں پتا ہے زیب! تم میری زندگی کا بہترین فیصلہ بنتی جارہی ہو۔" ان کے شانوں پہ ہاتھ جمائے وہ محبت پاش نظروں سے ان کا صبیح چہرہ دیکھنے لگے۔ جس پہ ان کی نگاہوں کی حدت نے گلابی رنگ بکھیر دیا تھا۔
"تمہاری اچھائی اور نرمی کا تو میں بہت پہلے ہی قائل ہو گیا تھا۔ لیکن جس خلوص اور حوصلے سے تم اب میرے گھر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ واقعی قابل تحسین ہے۔"
"اچھا!" وہ ہونٹوں پہ شرگیں مسکان لیے فقط یہی کہہ سکی تھیں۔ صغیر صاحب نے ان کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔
"بالکل۔ میں حقیقتاً" اللہ کے بعد یاسمین کا شکر گزار ہوں، جس نے میرے لیے تمہارا انتخاب کیا۔" اور ان کی اس درجہ محبت اور عزت نے زیب کی آنکھیں نم کر دیں۔
"یا اللہ مجھے ہمیشہ میرے شوہر کی توقعات پہ پورا اترنے کی توفیق عطا فرمانا۔" اس پل انہیں اپنے کندھوں پہ ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سنی اپنی حرکت اور گھر پہ صغیر صاحب کی موجودگی دونوں سے باخوبی واقف تھا۔ اسی لیے ساری شام اپنے کمرے کے باہر پھٹکا تک نہ تھا۔ زیب کے کہنے پہ شمیم اسے اس کے کمرے میں ہی رات کا کھانا کھلا آئی تھی۔ لیکن جس وقت وہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر جانے لگی تھی تب صغیر صاحب نے اسے منع کر کے خود اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا تھا۔
"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" جاشی کو کھانا کھلاتی زیب نے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن وہ بنا کوئی جواب دیے ڈائننگ روم سے باہر نکل گئے تھے۔
دروازے پہ دستک کی آواز پر ویڈیو گیم کھیلتے سنی نے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا تھا اور شمیم کی جگہ صغیر صاحب کو دیکھ کر اس کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ وہ شام میں ان کی غصے بھری پکار سن چکا تھا۔
"دھیان سے بھئی۔ بونا سیڑھیوں سے گر جائے گا۔" وہ اس کے چہرے پہ پھیلا ڈر دیکھ چکے تھے، اسی لیے قصداً" نارمل لہجے میں بولتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر چلے آئے تھے۔
"یہ بونے والا گیم نہیں ہے۔" دھیرے سے کہتا وہ رخ موڑ کے ہاتھ میں پکڑی گیم پر نظریں جما گیا تھا۔
"اچھا تو پھر کون سا گیم ہے؟" دودھ کا گلاس ایک طرف رکھی میز پر رکھ کے وہ بیڈ پہ اس کے برابر آبیٹھے تو سنی نے جھجکتے ہوئے سر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔
"آپ مجھے ڈانٹنے آئے ہیں کیا؟" بلاشبہ وہ ایک ذہین بچہ تھا۔
"تو آپ جانتے ہو کہ آپ نے غلط حرکت کی ہے۔" اس کے گول مٹول چہرے پہ نگاہیں جمائے صغیر صاحب نے نرم لہجے میں کہا تو سنی کی معصوم آنکھوں میں شرمندگی پھیل گئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔
"سچ بتاؤں تو میں آپ کو واقعی ڈانٹنے والا تھا۔ لیکن پتا ہے، مجھے کس نے روکا؟" صغیر صاحب نے رک کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
"کس نے؟" سنی نے حیرت سے سوال کیا۔
"آپ کی زیب آنٹی نے۔" اور بغور ان کی بات سنتا سنی ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ "وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں بیٹا۔ اس لیے تو آپ کو بھی ان سے پیار کرنا چاہیے۔" انہوں نے اسے بازو کے حلقے میں لیا۔
"لیکن مجھے وہ اچھی نہیں لگتیں۔" اس کے لہجے میں بے زاری در آئی۔
"مگر کیوں؟"
"کیونکہ وہ ہماری فیملی میں گھس آئی ہیں اور اب جاتی ہی نہیں ہیں۔ اوپر سے مما کو بھی مار دیا انہوں نے۔" اس کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ملال بھی

پھیل گیا۔
"بُری بات سنی ایسے نہیں کہتے۔" انہوں نے تادیبی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"آپ کی مما جب بیمار تھیں تو کتنا خیال رکھتی تھیں وہ ان کا۔"
"ہاں تو پھر ٹھیک کیوں نہیں کیا انہوں نے مما کو؟ کیوں اپنا پرامس توڑا؟" اس نے دوبدو سوال کیا۔ صغیر صاحب اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔
"اس لیے بیٹا کہ ٹھیک اللہ پاک کرتے ہیں۔ انسان نہیں۔"
"بس مجھے نہیں پتا۔ آپ ان سے کہیں کہ چلی جائیں یہاں سے۔ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں!"
وہ اپنے مخصوص ہٹیلے انداز میں بولا تو صغیر قاضی کتنے ہی لمحے اسے بے بس نظروں سے دیکھتے رہے۔ یوں جیسے سوچ رہے ہوں کہ انہیں کچھ کہنا چاہیے یا نہیں اور پھر آن واحد میں وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئے۔
"وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں بیٹا۔" وہ دھیرے سے بولے تو سنی بری طرح جھنجلا گیا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ کیونکہ آپ کی مما انہیں آپ کی نئی امی بنا کر گئی ہیں بیٹا۔"
"کیا؟" سنی کی آنکھیں باپ کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔
یہی وہ سچائی تھی جو یاسمین اپنے پیارے بیٹے کو بہت طریقے سے خود بتانا چاہتی تھیں لیکن وقت نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور اب یہ چیز زیب کے لیے ایک امتحان بن کر رہ گئی تھی۔
وہ جو اس گیارہ سالہ بچے کے یقین کی کسوٹی پہ پہلے ہی کھری اتر نہ پائی تھیں۔ اس انکشاف کے بعد تو بالکل ہی بے اعتبار ٹھہرادی گئی تھیں۔ بلکہ ایک وہ ہی کیا سنی تو اپنے باپ تک سے نالاں اور گریزاں ہو گیا تھا۔
ان دو دنوں میں اس نے خود کو کمرے سے اسکول تک محدود کر لیا تھا۔ اسے راضی کرنے کی ہر تدبیر ناکام رہی تھی۔ اس کی یہ ناراضی زیب جیسی نرم اور حساس خاتون کا دل مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ سنی کی شخصیت پہ کسی قسم کے منفی اثرات نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ یاسمین سے کیا اس کے بچوں کی بہترین پرورش کا وعدہ ہر حال میں نبھانا چاہتی تھیں۔ ایسے میں انہیں دونوں بچوں کا ردعمل الگ ہولائے جارہا تھا جو تاحال حقیقت سے بے خبر تھیں۔
کاش انہوں نے صغیر صاحب سے یہ شادی ہی نہ کی ہوتی۔ لیکن تب کیا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی اور راستہ موجود تھا؟

☆ ☆ ☆

"کیا؟" زیب نے سامنے بیٹھی اپنی بچپن کی سہیلی کو یوں دیکھا تھا گویا ان کی دماغی حالت پہ شک ہو۔
"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔
"دماغ ہی تو نہیں ٹھیک۔" یاسمین پھیکی سی مسکراہٹ لیے بولیں۔ تو زیب کو بے اختیار اپنے جملے کی غلطی کا احساس ہوا۔
"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہوئیں۔
"جانتی ہوں تمہارے تمام مطلب۔" یاسمین یک لخت نارمل لہجے میں بولیں۔ زیب نے انہیں دیکھتے ہوئے اک گہری سانس لی۔
"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو یاسمین؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟" وہ بھی مکمل طور پر سنجیدہ ہو گئیں۔
"بات برائی اچھائی کی نہیں ہے۔ تم، تم یہ دیکھو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم اپنے ہی شوہر کی شادی کی بات کر رہی ہو اور وہ بھی مجھ سے! لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"
"خدانخواستہ میں کوئی غلط یا انوکھی بات تو نہیں کر رہی۔۔۔ بہت سی بیویاں اپنے شوہروں کی خود شادیاں

کرواتی ہیں... کبھی اولاد کے لیے، کبھی اولاد نرینہ کے لیے اور کبھی یونہی ان کی منشاء پہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہیں۔ اس میں اتنی حیرت یا ناگواری والی بات کیا ہے؟" یاسمین نے سکون سے ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن میرے لیے اس میں ناگواری والی بات ہے میں احمد کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے قطعیت سے بولیں۔ یاسمین نے اک گہری سانس لی۔

"احمد بھائی کی جگہ اور کوئی لے بھی نہیں سکتا۔ تمہاری اور ان کی گیارہ سالہ رفاقت تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے۔ تمہارے غم نے اماں جان کو ختم کردیا۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی لمبی زندگی کیسے گزارو گی؟"

"کسی طور گزر ہی جائے گی۔ میں بھی کوئی انوکھی بیوہ نہیں ہوئی۔" وہ تلخ ہوئیں۔

"وہ کسی طور کیا ہوگا زیب؟ تم جوان ہو۔ اکلوتی اولاد تمہاری چھوٹی۔ ماں کا تمہاری انتقال ہوگیا۔ باپ بھائی تمہارے کوئی نہیں۔ اکلوتی بہن اور بہنوئی تمہارے دور جانے والے ہیں۔ سسرال والے تمہیں پوچھنے کو تیار نہیں۔ ایسے میں وہ کسی طور کیا ہو سکتا ہے زیبی؟" یاسمین حقائق گنوانے پہ آئیں تو پھر بولتی چلی گئیں۔

"پتا نہیں۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ بے اختیار گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو یاسمین نے دکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیوں خود کو بند گلی میں کھڑا کرنے پہ تلی ہوئی ہو زیب۔ دیکھو انجم آپا اور ابراہیم بھائی دونوں تمہاری طرف سے کتنے پریشان ہیں... اماں کے انتقال نے حالات کو یکسر بدل دیا ہے زیبی۔"

"چپ ہو جاؤ یاسمین۔ خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جاؤ!" ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے وہ غصے سے چلائیں۔ یاسمین بے اختیار خاموش ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن میرے پروپوزل پہ غور کرنا اور یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے زیب۔ اشد ضرورت!" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور پیچھے زیب دونوں ہاتھوں میں سر گرائے کتنی ہی دیر روتی رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

ہفتے کا دن تھا۔ انجم آپا اور ابراہیم بھائی اس کی تنہائی کے خیال سے ویک اینڈ گزارنے اماں کی طرف چلے آئے تھے۔ رات کھانے کے بعد لاؤنج میں گپ شپ کرتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے کافی کا بڑا مزیدار دور چلا تھا۔ جس کے بعد وہ دونوں بہنیں سب کے سونے کے بعد ٹیرس پہ چلی آئی تھیں۔

"ایک بات پوچھوں زیبی؟" ادھر ادھر کی باتوں کے دوران انجم نے اچانک سوال کیا تو زیب قدرے حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"پوچھیں آپا! اس میں بھلا اجازت کی کیا بات ہے؟"

"تم نے یاسمین کے پروپوزل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ان کے چہرے پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولیں تو زیب بری طرح چونک گئیں۔

"آپ اس بارے میں جانتی ہیں؟"

"ہاں... تم سے بات کرنے کے بعد وہ میری طرف آئی تھی۔" ان کے جواب نے زیب کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار کردیں۔

"پاگل ہوگئی ہے وہ تو۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔"

"زیب! اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔" انجم نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"پلیز آپا!" زیب نے خفگی سے بہن کی جانب دیکھا۔ جس کا دوسری طرف کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

"تم جانتی ہو، اس نے صغیر کو بھی راضی کرلیا ہے۔"

"کیا؟" اس انکشاف نے زیب کا رنگ اڑا دیا۔ وہ

کتنے ہی پل بولنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

"اف میرے اللہ! میں اس شخص کا سامنا اب کیسے کروں گی!" سر تھامتے ہوئے ان کی آواز مارے بے بسی کے بھر آئی۔

"اس میں ایسی کیا بات ہے۔ کوئی تم نے خود تو اپنا پیغام اسے نہیں بھجوایا۔"

انجم قصداً "سختی سے بولیں تو زیب نچلا لب دانتوں تلے دبائے رخ پھیر گئیں۔ انجم نے بے اختیار اک گہری سانس لی۔ وہ ان کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتی تھیں۔

"دیکھو زیبی! تم ایک بار حالات کو یاسمین کی نظر سے بھی دیکھو۔۔۔ وہ ایک ایسی عورت ہے۔ جس کا کینسر آخری اسٹیج پہ پہنچ چکا ہے۔ میکے میں اس کی چار بھاوجوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ صغیر اپنی فیملی میں اکلوتا ہونے کی وجہ سے تن تنہا ہے۔۔۔ ایسے میں اگر وہ منطقی ہو کے سوچ رہی ہے اور اپنی زندگی میں ہی اپنے دونوں بچوں کو محفوظ اور قابل بھروسہ ہاتھوں میں سونپنا چاہتی ہے تو کیا غلط ہے؟ کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ چاہے صغیر آج بیوی کا دم کیوں نہ بھرے' لیکن بہر کیف وہ آنے والے وقت میں اتنے چھوٹے بچوں اور گھر کو تنہا تو نہیں سنبھال سکتا؟ اور یاسمین میں کسی انجانی عورت کو اپنے بچے سونپنے کا حوصلہ نہیں۔۔۔ ارے میں تو سلام کرتی ہوں اس کی بہادری اور اس کی ہمت کو' جو اتنے حوصلے سے آنے والے وقت کی تیاریاں کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ کسی عورت میں اتنی دوراندیشی اور دل گردہ ہوا کرتا ہے؟"

زیب کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ نرم لہجے میں تصویر کا دوسرا رخ ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ تو نا چاہتے ہوئے بھی زیب کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا اور وہ بہن کی طرف دیکھنے لگیں۔

"زیبی میری جان یہ اس کا تمہاری ذات پہ بھروسہ اور محبت ہی ہے۔ جو وہ تم میں اپنا آپ دیکھ رہی ہے۔ سوچو ذرا کتنا کڑا وقت ہے اس پر' جو اپنی زندگی میں اپنے بچوں کے لیے اپنا متبادل ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسے میں اگر اس کا دل تمہاری جانب مائل ہوا ہے تو بحیثیت ایک عورت اور انسان کے یہ تمہارے لیے کتنے فخر کی بات ہے۔ وگرنہ اس کے خاندان یا صغیر کی فیملی میں بہنوں' بیٹیوں کی کمی ہے کیا؟ اور پھر وہ صرف اپنا ہی نہیں بلکہ تمہارا بھی بھلا چاہ رہی ہے' اس کے گھر کو اگر تمہاری ضرورت ہے تو تمہیں بھی اس گھر کی ضرورت ہے زیبی۔" ان کا ہاتھ تھامے انہوں نے رسان سے کہا۔

زیب کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔

"اور میری اولاد! اس کا کیا ہو گا؟" زیب نے پسپا سے لہجے میں سوال کیا تو انجم کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔

"تم نے کیا انہیں اتنا ہی خود غرض سمجھ رکھا ہے؟ یاسمین اور صغیر دونوں کا یہی کہنا ہے کہ وہ تم سے پہلے تمہاری اولاد کو قبول کریں گے۔" اور زیب خاموشی سے بہن کو تکنے لگیں۔

"اور اگر ہماری اولادوں نے ہی اس تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو؟" اور اتنی دیر میں پہلی بار انجم جواباً "کچھ بول نہ پائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بچوں کو کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے یاسمین؟" انجم نے اچنبھے سے یاسمین اور ان کے برابر بیٹھے صغیر قاضی کی طرف دیکھا۔ "بچوں کو ذہنی طور پہ تیار کرنا بہت ضروری ہے۔"

"ایک بات بتائیں آپا' ہم بچوں کو کیا کہہ کر تیار کریں گے۔۔۔ دوسری ماں یا سوتیلا باپ؟ اس تعارف کے بعد آپ ہی کہیں بھلا کوئی بچہ ذہنی طور پہ کبھی تیار ہو پائے گا؟" یاسمین نے ان کی جانب دیکھا تو وہاں موجود سبھی افراد خاموش ہو گئے۔

"کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں یاسمین۔" ابراہیم صاحب نے بے اختیار ان کی تائید کی۔ "لیکن پھر یہ سب کیسے ہو گا؟"

"بھائی جان میں چاہتی ہوں کہ بچے ایک دوسرے کو اور زیب اور صغیر کو خود پرکھیں اور قبول کریں۔ زیب کا تعارف میں اپنے گھر میں اپنی پیاری دوست کی حیثیت سے کروانا چاہتی ہوں اور میرے خیال سے زیب کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ بچے ایک بار جب سب سے مانوس ہو جائیں گے اور آپس میں گھل مل جائیں گے تو ہمارے لیے انہیں سمجھانا اور ان کے لیے ان رشتوں کو دل سے قبول کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ ساری بات ہی دل سے قبول کرنے کی ہے۔" انجم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں یاسمین ٹھیک کہہ رہی ہیں.... بچے بہت چھوٹے تو ہیں نہیں۔ اس لیے ان پر اتنی بڑی تبدیلی مسلط کرنے کے بجائے انہیں رفتہ رفتہ خود ہی اس کا حصہ بننے دیا جائے۔"

اور پھر یہی ہوا تھا۔ بچوں کے علم میں لائے بغیر زیب، صغیر قاضی اور یاسمین صغیر، تینوں ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ اس نئی تبدیلی کو دونوں بچیوں نے بڑی خوشدلی سے قبول کیا تھا اور جلد ہی آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ لیکن سنی جیسے ضدی اور بوزیسو بچے کے لیے اپنے گھر میں دو اجنبیوں کی آمد کو قبول کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ وہ ہر چوتھے دن اپنی ماں سے ان کی واپسی کے متعلق سوال کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ جواباً" یاسمین اسے مسلسل ٹوکتی اور سمجھاتی رہتی تھیں۔ زیب بھی اس کے قریب آنے کے مختلف حیلے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن سنی کو قائل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ یاسمین کا بے حد لاڈلا اور بگاڑا ہوا تھا۔

پھر ایک روز یاسمین کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ان کا مرض دنوں میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ ہر چیز پس پشت چلی گئی تھی۔ یاد رہ گئی تھی تو صرف یاسمین کی ذات جو بہت تکلیف میں تھی۔ ایسے وقت میں زیب نے ایک بہن کی طرح اپنی سہیلی کو سنبھالا تھا۔ ان کی دن رات کی خدمتوں نے خاندان کے ان تمام لوگوں پر یاسمین کے فیصلے کی درستی کو ثابت کر دیا تھا جنہوں نے صغیر قاضی کی دوسری شادی کی مخالفت کی تھی۔

ماں کی طبیعت خرابی سے سہم کر سنی نے بھی زیب کی ممتا بھری آغوش میں پناہ لی تھی۔ اس نے زیب سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جلد اس کی ماں کو ہسپتال سے ٹھیک کروا کے گھر لے آئیں گی وہ ماں کے مرض کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یاسمین کی موت نے زیب کو اپنا وعدہ نہیں نبھانے دیا تھا۔ وہ سنی کی خواہش پوری نہ کرپائی تھیں اور اس کی معصوم نظروں میں جھوٹی اور بے اعتبار ٹھہری تھیں۔ لیکن صغیر صاحب کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ اس کی ماں کے عہدے پہ فائز ہو چکی' زیب کو اس کی معصوم نگاہوں سے چھلکتی نفرت میں اپنے لیے ایک اور ٹائٹل نظر آیا تھا۔ وہ ٹائٹل جو وہ جانتی تھیں کہ اب ساری زندگی نہیں بدلنے والا۔ خواہ وہ کچھ بھی کرلیتیں۔ اور وہ لقب تھا ایک غاصبہ کا۔ ایک ایسی عورت جس نے اس کی ماں کے بعد اس کے باپ اور اس کے گھر پہ قبضہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مت روزی اللہ نے چاہا تو آہستہ آہستہ حالات نارمل ہو جائیں گے۔" زیب فون کان سے لگائے انجم سے بات کر رہی تھیں۔ ان کی تسلی پہ انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"مجھے نہیں لگتا آپا۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں اس بچے نے مجال ہے، جو مجھ سے ایک جملہ بھی کہا ہو.... اتنے چھوٹے سے بچے کا اتنا شدید رد عمل' اتنی ضد' میں تو حیران رہ گئی ہوں۔"

"صغیر کیا کہتا ہے اس بارے میں؟"

"وہ تو خود پریشان ہو گئے ہیں اس کے رویے کی قطعیت سے بڑی مشکل سے جا کے تو اس نے ان سے بات چیت شروع کی ہے۔" زیب کی بات پہ انجم بھی پریشان ہو گئیں۔

"تم لوگ کسی سائیکالوجسٹ کی مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"میں تو یہ بات صغیر سے نہیں کہہ سکتی آپا!" وہ دھیمے لہجے میں بولیں تو انجم بھی چپ ہو گئیں۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ وہاں کی سنائیں؟ دل لگ گیا آپ کا؟"

"کیسا دل اور کہاں کا لگنا۔ ابراہیم جو صبح سے جاتے ہیں تو شام میں اور کبھی کبھار تو رات میں واپس آتے ہیں۔ ہم دونوں سارا دن گھر میں ہوتے ہیں۔ بہت ہوا تو پارک تک چلے گئے۔ یا قریبی مارکیٹ تک' نہ کوئی جان نہ کوئی پہچان۔ ہاں ویک اینڈ پہ ابراہیم ہمیں گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں۔"

"اس کے ایڈمیشن کا کیا بنا؟" زیب نے سوال کیا۔

"ابھی فارمیلٹیز ہیں۔ کچھ ٹائم لگے گا۔ تب تک میں اسے گھر پہ ہی پڑھا رہی ہوں۔"

"یہ اچھا کر رہی ہیں۔ اس کے کوئی دوست وغیرہ بنے؟"

"ہاں ایک دو بچے ہیں آس پڑوس میں۔ لیکن یہاں کا ماحول اف میری توبہ! میں تو کہتی ہوں ابراہیم سے پتا نہیں کہاں آ پھنسے ہیں ہم۔" انجم کے لہجے کی بیزاری نے زیب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"آپ جہاں پھنسی ہیں نا وہاں پھنسنے کے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔"

"چھوڑو' ہوں گے کوئی سطحی قسم کے لوگ۔ میرے تو نہ ایسے کوئی خواب تھے اور نہ آرزو۔ یہ تو تمہارے بھائی کو دوست کے ساتھ کاروبار کی دُھن یہاں تک کھینچ لائی ورنہ اگر میرا بس چلے تو منٹ نہ لگاؤں واپسی میں۔"

"کسی نے صحیح کہا ہے انسان کسی حال میں خوش نہیں۔" زیب بے اختیار ہنس پڑیں۔

"یہ تو ہے۔" انجم بھی مسکرا دیں۔ "اچھا زیبی باہر دروازے پہ دستک ہو رہی ہے۔ میں رکھتی ہوں۔"

"او کے آپا! اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" دوسری طرف سے بھی الوداعی کلمات کہنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا گیا تو زیب کریڈل پہ فون رکھتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تب ہی لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کے صغیر قاضی اندر چلے آئے۔ وہ خاصی عجلت میں تھے۔

"زیبی! فٹافٹ میرا بلیک ڈنر سوٹ نکال دو۔ مجھے ایک بزنس ڈنر پہ جانا ہے۔"

"اچھا جی آپ فریش ہوں' میں نکالتی ہوں۔" وہ ان کے پیچھے چلتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

انہیں کمرے میں گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی' جب بچوں کی چیخ و پکار پہ وہ دونوں گھبرا کے باہر نکل آئے۔ شور کی آوازیں سنی کے کمرے سے آتی سن کر وہ اس کے کمرے کی جانب بھاگے۔ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی؟" سنی' جاشی کے ساتھ کھڑی دس سالہ بچی کو گھور رہا تھا۔ جس کی رنگت مارے خوف کے زرد پڑ گئی تھی۔ بے اختیار صغیر صاحب نے آگے بڑھنا چاہا تھا۔ لیکن نجانے کس احساس کے زیر اثر زیب نے ان کا بازو تھام کر انہیں سر کے اشارے سے اندر جانے سے منع کر دیا تھا۔

"وہ بھائی! لاؤنج میں آپ کا گیم پڑا تھا۔ ہم وہ آپ کو دینے آئے تھے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا تو سنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں ہوں میں تمہارا بھائی' سمجھیں!" دانت پیستے وہ آگے آیا تو وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جمع ہونے لگے۔

"مت کریں بھائی۔ کیوں ڈانٹ رہے ہیں آپ اسے؟" سات سالہ جاشی نے سنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

"تم چپ کرو!" اس نے پلٹ کر غصے سے جاشی کو گھر کا۔ "خبردار جو تم نے اس گندی لڑکی کی سائیڈ لی!"

"لوں گی وہ فرینڈ ہے میری۔" جاشی بھاگ کے دوسری طرف اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

"کوئی فرینڈ نہیں ہے یہ تمہاری۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے۔" سنی نے غصے سے بہن کو گھورتے

ہوئے کہا تو اس کے منہ سے "اسٹیپ سسٹر" کا لفظ سن کے جہاں زیب ہکا بکا رہ گئیں، وہیں صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"جھوٹ بول رہے ہیں یہ۔ میں تمہاری کوئی اسٹیپ سسٹر نہیں ہوں جاشی۔" اس نے تڑپ کر اس گندے الزام کو خود پہ سے ہٹایا تھا۔ بھلا وہ کوئی سنڈریلا کی اسٹیپ سسٹرز جیسی تھی..... بدصورت، چالاک اور بری۔

"ہونہہ! بلکہ صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہاری امی بھی اسٹیپ مدر ہیں، ہماری!" سنی کی بات پہ زیب اور صغیر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے دیکھا تھا۔ جبکہ اندر موجود بچی اس نئے الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔

"کوئی نہیں جی۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ کسی کی اسٹیپ مدر نہیں۔" اس نے غصیلی نظروں سے سنی کو دیکھا۔

"ہاں جی، زیب آنٹی بہت اچھی ہیں۔" جاشی نے فوراً تائید کرتے ہوئے اپنی سہیلی کا بازو تھاما۔ دوست کا سہارا ملتے ہی وہ بچی یک لخت بہادر ہو گئی۔

"آپ خود ہوں گے اسٹیپ برادر گندے، برے اور....." اگلے ہی پل غصے میں کھولتے سنی کا ہاتھ گھوما اور اس کے چہرے پہ چٹاخ کی آواز سے تھپڑ پڑا۔ تھپڑ لگتے ہی وہ پھپک کے رو پڑی اور صغیر صاحب ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے سرعت سے اندر چلے آئے۔

"سنی!" تنبیہی انداز میں اسے پکارتے ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کے اس روتی ہوئی گڑیا کو گود میں اٹھا لیا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی بہن پہ ہاتھ اٹھانے کی؟" وہ اسے گھورتے ہوئے دھاڑے تو جاشی بھاگ کر زیب کی ٹانگوں سے جا لپٹی۔ زیب کا ہاتھ بے اختیار اس کے سر پہ آٹھہرا۔ جبکہ نگاہیں اندر کمرے میں جمی تھیں۔

"کوئی نہیں ہے یہ میری بہن۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ ڈھٹائی سے بولا تو صغیر صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"بدتمیزی کرتے ہو!" انہوں نے آگے بڑھ کے اس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا تو وہ بے اختیار رو دیا۔ زیب فوراً جاشی کو ایک طرف کرتی اندر چلی آئیں۔

"صغیر! کیا کر رہے ہیں آپ؟" انہوں نے سرعت سے روتے ہوئے سنی کو اپنی جانب کھینچا۔ لیکن وہ ان کی گرفت میں بری طرح مچلنے لگا۔

"چھوڑیں مجھے۔ نہیں آنا میں نے آپ کے پاس۔"

"سنی!" صغیر صاحب غصے میں کھولتے آگے کو آئے۔ انہیں بڑھتا دیکھ کے زیب نے سنی کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ روتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا اور پیچھے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"لائیں اسے مجھے دیں۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد زیب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا تو صغیر صاحب نے ان کے ہاتھوں کو نظرانداز کرتے ہوئے گود میں اٹھائی گڑیا کا چہرہ چوما۔

"میں فی الحال اپنی بیٹیوں کو آئس کریم کھلانے لے جا رہا ہوں۔ تم چلو گی؟" اور زیب نے اپنے شریک سفر کے پرخلوص چہرے کو تکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لیکن سنی کے لیے یاد سے پیک کروا کے لائیے گا۔" وہ دھیرے سے بولیں تو صغیر قاضی بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ واقعی ان کے بچوں کی بہترین ماں تھیں۔

☆ ☆ ☆

وقت چند ماہ آگے سرکا تھا اس تکلیف دہ انکشاف کے بعد کہ سنی کے ذہن میں سگے اور سوتیلے کا فرق واضح طور پہ موجود ہے، صغیر صاحب اور زیب نے خود بٹھا کے دونوں بچیوں کو ان دونوں کے درمیان موجود ایک اور پیارے سے رشتے کا احساس دلایا تھا۔ انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی صرف سہیلیاں ہی نہیں بلکہ بہنیں بھی ہیں اور وہ سب ایک ہی فیملی کا حصہ ہیں۔ جس میں صغیر صاحب سب کے ڈیڈی اور زیب سب کی امی ہیں۔

زیب کے مشورے پہ صغیر قاضی شہر کے مشہور سائیکالوجسٹ کے پاس منی کا مسئلہ لے کر گئے تھے۔ ان کے مشوروں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ باپ اور بہن کے ساتھ ٹھیک سلوک کرنے لگا تھا جبکہ زیب کے لیے اس کے انداز میں خاموشی اتر آئی تھی۔ اس کی اتنی سی تبدیلی پر ہی ان دونوں نے سکھ کا سانس لیا تھا اور ابھی ان کے درمیان ایک اور خبر ہلچل مچانے آ گئی تھی۔

"کیا؟" صغیر صاحب نے خوشگوار حیرت سے منہ لٹکائے بیٹھی زیب کی طرف دیکھا۔

"جی۔ میری رپورٹ پازیٹو ہے۔"

"او میرے خدا! اتنی خوشی کی خبر۔ اور تم اتنا برا سا منہ بنا کے بیٹھی ہو؟" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ان کے قریب چلے آئے۔

"آپ سمجھ نہیں رہے۔ میں بہت عجیب سا فیل کر رہی ہوں۔ اتنے عرصے بعد..."

"اوں ہوں۔" صغیر صاحب نے بے اختیار ان کے لبوں پر انگلی رکھ دی۔ "اللہ پاک ہم پہ مہربان ہوا ہے زیب۔ اس کی ناشکری مت کرو۔" اور زیب چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ پائیں۔

"ہمارا ساتھ مکمل کرنے کے لیے شکریہ۔ میں سچ میں بہت، بہت خوش ہوں۔" فرط جذبات میں انہوں نے مسکراتے ہوئے انہیں خود سے لگا لیا تھا۔ ان کی اس درجہ خوشی اور اطمینان پر زیب صغیر کا دل بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نیویارک شہر میں یہ ایک عام سا نائٹ کلب تھا۔ جہاں قانونی اور غیر قانونی سبھی کام ہوتے تھے اور اس جیسے ایڈونچر کے شوقین کم عمر لڑکے کو یہاں کی غیر قانونی شہرت ہی کھینچ کے لائی تھی۔ وہ اپنے تینوں دوستوں کے بلاوے پہ، جن کی عمریں تیرہ چودہ کے لگ بھگ تھیں۔ آج پہلی بار اپنے ماں باپ سے چھپ کے ایسے کسی ایڈونچر پہ نکلا تھا اور اندر پہنچ کے

اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں' وہاں موجود حسیناؤں کے حلیے دیکھ کے وہ کتنی دیر کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں کو دیکھ کے بغور اس کی حالت زار کا جائزہ لیتے' اس کے تینوں دوست ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے۔

"منہ تو بند کر لو یار' کہیں مکھی نہ چلی جائے۔" اس کے ایک دوست نے شرارت سے آگے بڑھ کے اس کی تھوڑی کو انگلی سے اوپر کیا تو باقی دونوں لڑکے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ جبکہ وہ خود اپنے حواسوں میں لوٹ آیا۔

"واؤ!" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے پہلے اپنے دوستوں کی طرف اور پھر دوبارہ سامنے اسٹیج کی جانب دیکھا۔ "میرا مطلب ہے..." اس نے نگاہیں ہٹائے بغیر کوئی اور تعریفی کلمہ سوچنا چاہا۔ مگر جب ذہن ساتھ نہ دے پایا تو فقط کندھے اچکا کر ہی کہہ سکا۔

"جسٹ واؤ مین!" اور وہ تینوں ایک بار پھر گلا پھاڑ کے ہنس پڑے۔

"ابھی سے واؤ مت کہو' ابھی تو تمہیں بہت کچھ دکھانا اور چکھانا ہے۔" اور سیم کی آنکھوں میں انوکھی چمک اتر آئی۔ وہ کسی کٹھ پتلی کی طرح اپنے دوستوں سے بندھا بھرکتے اور بہکتے لوگوں کو مشتاق نظروں سے تکتا' ایک جانب بنے لمبے سے بار کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"کیا لو گے تم؟" وہاں موجود پینے والوں کو ایک طرف ہٹاتے' وہ چاروں کاؤنٹر کے ساتھ آ لگے تو اس کے دوست نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا پتا۔ میں نے پہلے کب پی ہے۔" اور اس کا دوست تاسف سے سر ہلاتا بیرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جبکہ سیم دلچسپی سے سامنے دیوار کے ساتھ سجی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی ایک خیال آنے پر وہ اپنے دوسرے دوست کی جانب جھکا۔

"یہ لوگ ڈرگز وغیرہ کہاں رکھتے ہیں؟" تیز میوزک کی وجہ سے وہ اس کے کان میں گھسا۔

"وہ اندر چھپا کے بیچی جاتی ہیں۔"

"ہم بھی لیں؟" اس نے اشتیاق سے کہا تو اس کے دوست نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی نادان بچہ ہو۔

"تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟" اور سیم بے اختیار شرمندہ ہو تا سیدھا ہو گیا۔

بیرے نے ان کا آرڈر لا کے ان کے سامنے رکھا۔ تو سیم کی پوری توجہ' سارا اشتیاق شیشے کے اس بڑے سے گلاس پہ مرکوز ہو گیا' جس کی باہری سطح پہ مشروب کی ٹھنڈک کے باعث پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔ جبکہ اندر بھرے سنہری براؤن مائع پہ اسے لحظہ بھر کو کہانیوں میں سنے طلسماتی سنہری پانی کا گمان ہوا تھا... برائی واقعی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کے دل نے بے اختیار اس کے باپ کے منہ سے سنے جملے کی تصدیق کی تھی۔ اس سے نظریں چرانا بڑے بڑوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو پھر ایک کچی عمر کا بچہ تھا۔

"واؤ! کتنا خوب صورت ہے یہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ اس نے بھلا یہ نظارہ کب دیکھا تھا۔

"کیا یہ گلاس؟" اس کے دوست نے حیرت سے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل!" اس کے شانے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے سامنے پڑا گلاس اٹھا کر ہوا میں بلند کیا۔

"ٹو سیم!" اس کے پرجوش نعرے پہ ان تینوں نے بھی اپنے اپنے گلاس اٹھا کے ہوا میں اونچے کیے۔

"ٹومی!" مسکراتے لبوں کے ساتھ اس کی آواز ان تینوں کی آواز میں شامل ہوئی تھی۔ اور پھر اس نے اس چمکتے مشروب کا بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا تھا۔ مشروب کی تیزی نے بڑی سرعت سے اس کے حلق میں سفر کیا تھا۔ اسے بڑی زور کا ٹھسکا لگا تھا۔ اس کی حالت زار پہ ایک بار پھر اس کے دوستوں کی ہنسی بے اختیار گونجی تھی۔

"ویلکم ٹو دا ورلڈ آف یور ڈریمز مائی فرینڈ!"

(تمہارے خوابوں کی دنیا میں تمہیں خوش آمدید میرے دوست !) ہنستے ہوئے اس کے دوست نے بری طرح کھانستے سیم کی پشت پہ ہاتھ مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح کاذب کا وقت تھا جب زیب کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ صغیر صاحب نے ایمرجنسی میں اپنی خالہ کو فون کر کے بچوں کے پاس آنے کے لیے کہا تھا اور خود زیب کو ہسپتال لے کر بھاگ گئے تھے۔ ایسے میں سنی جب اسکول کے لیے اٹھا تھا تو گھر میں دادی جان اور ملازموں کے سوا کسی کو نہ پا کے وہ فردوس بیگم کے پاس چلا آیا تھا۔

"سب کہاں ہیں دادی جان؟"

"تمہاری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔ اس لیے تمہارے ڈیڈی انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" فردوس بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ہسپتال اور طبیعت خرابی کا سن کے سنی کی آنکھوں میں یک لخت چمک سی اتر آئی۔

"کیا وہ بھی مرنے والی ہیں دادی جان؟" اس نے اشتیاق سے سوال کیا تو فردوس بیگم بے اختیار دہل گئیں۔

"اللہ نہ کرے بیٹا۔ وہ تو تمہارے لیے نئے بہن بھائی لینے گئی ہیں۔" انہوں نے اسی سوال کو اس کے اندر کا خوف جان کر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کے انکار نے سنی کے اشتیاق پر اوس گرا دی تھی۔۔۔

"انہیں کس نے کہا ہے کہ نئے بہن بھائی لائیں۔ ہمیں نہیں چاہئیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ یہ تحفہ تو اللہ تعالیٰ خود بھیج رہے ہیں تمہارے لیے۔ تمہارے ڈیڈی کے لیے۔"

ان کی بات پہ وہ بے اختیار چونکا۔

"ہماری فیملی کے لیے؟" اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "یعنی میرے لیے جاشی کے لیے اور ڈیڈی کے لیے؟" اس نے اپنے تئیں اپنی ذاتی فیملی کی وضاحت کی تو اس کے اصل مفہوم سے بے خبر فردوس بیگم ہنس پڑیں۔

"ہاں بھئی تم تینوں کے لیے۔ اب جاؤ اور جا کے منہ دھولو۔" انہوں نے اس کا چہرہ سہلایا تو دادی جان سے تصدیق پا کے سنی مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

زیب اور صغیر قاضی کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹی سے نوازا تھا۔ ننھی پری کی آید نے "قاضی ولا" میں رونق کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ سنی بھی اپنی چھوٹی بہن کو پا کے خاصا خوش تھا' وہ اور بات تھی کہ کسی کو بھی اس کے اطمینان اور خوشی کی اصل وجہ معلوم نہ تھی۔ اس کے رد عمل نے زیب اور صغیر دونوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ورنہ اس تمام عرصے میں سنی کے رد عمل کو لے کے زیب بے حد پریشان رہی تھیں۔ لیکن اب اسے دیکھ کر انہیں لگتا تھا جیسے اللہ نے ان کی اس مشکل کو آسان کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گنگناتے ہوئے جس وقت گھر میں داخل ہوا دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ اپنا اسکول بیگ صوفے پہ اچھالتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی پڑے کچن میں ڈالی تھی۔

"مام! کہاں ہیں آپ؟" پلٹ کر اپنی ماں کو پکارتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا۔

"میں نیچے ہوں بیٹا۔" ان کا جواب تہہ خانے سے آیا تو اس کے بڑھتے قدم پل بھر کو رکے اور پھر نیچے جاتے زینے کی جانب اٹھنے لگے۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آ کھڑا ہوا جو ایک جانب رکھی الماری میں سے کچھ چیزیں نکال رہی تھیں۔

"میں۔۔۔" سیدھی ہوتے ہوئے وہ اپنے خوبرو بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"میں نے یہاں کچھ گفٹ آئٹمز رکھے تھے وہ نکال رہی تھی۔ تم بتاؤ آج اتنی دیر کیوں ہو گئی آنے میں؟" انہوں نے اپنی سانس برابر کی۔

"آج کوچ نے پریکٹس رکھ لی تھی۔ اس لیے دیر ہو گئی۔" وہ اپنے اسکول کی باسکٹ بال ٹیم میں تھا۔ "اس بیگ میں کیا ہے؟" اس نے باہر نکالے گئے سامان میں سے ایک بڑے سے نیلے بیگ کی طرف اشارہ کیا تو اس کی ماں اس بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگیں۔

"اس میں تمہارے بچپن کی چیزیں ہیں۔"

"دکھائیں....." وہ اشتیاق سے آگے بڑھا تو انہوں نے بیگ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ وہیں کارپٹ سے ڈھکے فرش پہ ایک جانب بیٹھ کر بیگ کھولنے لگا۔

"او! یہ میرے فراک ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے تہہ کیے ہوئے بالکل چھوٹے چھوٹے فراکوں کا ایک ڈھیر نکالا تو اس کی ماں ہنستے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"ہاں۔"

"لیکن میں تو لڑکا ہوں۔" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"جسٹ بارن بے بیز کو فراک ہی پہناتے ہیں۔ اب چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔" ان کی وضاحت پہ وہ مسکراتے ہوئے پرشوق نظروں سے ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر بیگ میں ہاتھ ڈال کر اور چیزیں نکالتا چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے لکڑی کا ایک منقش باکس نکال کر اسے اشتیاق سے دیکھا۔

"یہ تمہاری نانی اماں کا ڈبا تھا۔" اس کی ماں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"اس میں کیا ہے مام؟" ماں کے تاثرات پہ وہ قریب کھسک آیا۔

"خود کھول کے دیکھ لو۔" انہوں نے مسکراتی نظروں سے ڈبا اس کے حوالے کیا تو وہ سامنے رکھ کے اسے کھولنے لگا۔ چھوٹا سا لاک کھول ...کے اس نے ڈھکن اٹھایا تو اندر تصویروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔

"یہ تو فوٹو گرافز ہیں۔" اس کی بات پہ اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کے تصویریں اٹھالیں اور ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی مام بھی تصویروں پہ جھک آئیں۔ لیکن جوں جوں تصویریں آگے بڑھتی گئیں اس کی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔ حتیٰ کہ اس نے بیچ میں ہی ہاتھ روک دیا۔

"رک کیوں گئے بھئی؟" اس کی مام نے حیرت سے نظریں ہٹا کے اس کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کو ہر تاثر سے عاری پا کے وہ بے اختیار ٹھٹک گئیں۔

"وہ مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ مال جانا تھا۔" تصویریں ڈبے میں رکھتے ہوئے وہ یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا تو بغور اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اوکے پھر شام میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ جھک کر ان کا گال چومتا سیڑھیاں پھلانگ گیا تو وہ پرسوچ نظروں سے سامنے پڑی تصویروں کو تکتے ہوئے اس کی اس عجیب حرکت کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

قائداعظم کی تصویر سے آراستہ مختلف ٹرافیوں اور شیلڈز کو دیوار گیر الماری میں سجائے یہ بڑا بارعب سا کمرہ اسکول پرنسپل کا تھا۔ جہاں صغیر قاضی اسے داخلے کی غرض سے لائے ہوئے تھے۔ ان کے برابر کرسی سنبھالے وہ دلچسپی سے اردگرد کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ ساتھ ہی کبھی کبھار ان دونوں کی گفتگو بھی سن رہی تھی جو کافی دیر سے جاری تھی۔

"آپ جانتے ہیں صغیر صاحب! سال کا مڈ چل رہا ہے۔ ایسے میں نیو ایڈمشن لینا ہمارے لیے خاصی دقت کا باعث ہے۔" پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے دبے الفاظ میں معذرت کی کوشش کی کیونکہ صغیر قاضی کے نا صرف دونوں بچے یہاں پڑھتے تھے بلکہ وہ ان کے اس مہنگے اور معروف تعلیمی ادارے کے ڈونر بھی تھے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری یہ بیٹی بھی اس سال سے ہی آپ کا اسکول جوائن کرے۔" انہوں نے اپنی بات دہرائی تو پرنسپل صاحب نے اک گہری سانس لی۔

"آپ نے اپنے دونوں بچوں کی طرح شروع سے ہی اسے یہاں داخل کیوں نہیں کروایا؟... انفیکٹ میرے تو آج ہی علم میں آیا ہے کہ آپ کی ایک اور بیٹی بھی ہے۔"

ان کی بات پہ جہاں صغیر صاحب پل بھر کو مشکل میں پڑ گئے وہیں اس کا دھیان ٹیبل پہ رکھے پاکستان کے جھنڈے سے ہٹ کر ان کی جانب مبذول ہو گیا۔ اسکول کا ڈونر ہونے اور بچوں کے یہاں پڑھنے کی وجہ سے پرنسپل صاحب ان کے ساتھ ساتھ اسکول میں بچوں کے سلسلے میں زیب کی آمدورفت ہونے والی تھی تو ان کا کم از کم پرنسپل صاحب سے تعارف تو ضروری تھا۔

"ایسا ہے کہ ان کی مدر کی خواہش تھی کہ یہ اس سکول میں پڑھے۔" سوچ کر بولتے ہوئے وہ لحظہ بھر کو رکے تھے۔ "ایکچولی شی از مائی اسٹیپ ڈاٹر۔" پل کے توقف کے بعد انہوں نے قصداً انگلش میں جملہ کہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ ان کے ساتھ بیٹھے وجود نے "اسٹیپ ڈاٹر" پہ ٹھٹھک کے ان کی جانب دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"امی!" زیب کچن میں رات کے اس وقت اکیلی کھڑی چھوٹی کے لیے پانی ابال رہی تھیں۔ جب وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"جی بیٹا۔" انہوں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا تھا جو اپنے رات کے پاجامہ سوٹ میں ننگے پاؤں شاید بستر سے اٹھ کر آئی تھی۔

"امی! آپ نے اور ڈیڈی نے تو کہا تھا کہ ہم سب ایک فیملی ہیں۔ پھر سنی بھائی مجھے سسٹر کے بجائے اسٹیپ سسٹر اور ڈیڈی خالی ڈاٹر کے بجائے اسٹیپ ڈاٹر کیوں کہتے ہیں؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے بوجھل لہجے میں سوال کیا تو زیب بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور نظریں اس کے معصوم پریشان چہرے پہ جم سی گئیں۔

"بتائیں نا امی... کیا میں واقعی سنڈریلا کی گندی اور بری بہنوں جیسی ہوں جو یہ لوگ مجھے "اسٹیپ" کہتے ہیں؟" ان کی خاموشی پہ وہ بے چینی سے دو قدم آگے آئی تو زیب نے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان! ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ بہت اچھی بہت پیاری ہو بیٹا!" ان کی آواز کوشش کے باوجود بھر آئی تھی۔

"پھر یہ سب مجھے "اسٹیپ" کیوں کہتے ہیں؟" وہ زور لگا کے ان کے بازوؤں سے نکلی تھی۔ اس کی تکرار پہ زیب کے ذہن سے ایک ایک کر کے سارے مناسب لفظ کہیں دور بھاگ نکلے تھے۔ نجانے دنیا بہت سی چیزوں کو اتنے کڑوے کسیلے نام کیوں دے دیتی ہے کہ پھر اگر کوئی چاہے بھی تو ان کے تلخ معنوں کو کسی بھی محبت بھرے لفظ کی چاشنی سے کم نہیں کر سکتا۔ ان کا نام ہی ان کا تعارف ہوتا ہے... نام لیا خاکہ واضح! پھر چاہے کوئی اس خاکے سے دور تک میل نہ کھاتا ہو، اسے اس لیبل کی تلخی کو تاعمر جھیلنا پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)